بسم الله الرحمن الرحيم

قیامِ حسینیؑ

''قیامِ امام حسین علیہ السلام کے علل و اسباب'' کے موضوع پر حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای (مدّظلّہ العالی) کی سال ۱۹۸۲ء اور سال ۱۹۸۴ء میں کی گئی دو تقاریر کا مجموعہ

مترجم: سید عقیل حیدر زیدی

بہ کوشش: مدیریت زائرین غیرایرانی آستان قدس رضوی

طبع اول: ۱۴۳۸ھ ق/۱۳۹۵ھ ش/۲۰۱۶ء

تعداد: ۱۰۰۰۰ نسخے

"قیامِ امام حسین علیہ السّلام
کے علل واسباب"

کے موضوع پر حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای (مدّظلّہ العالی) کی
سال ۱۹۸۲ء اور سال ۱۹۸۴ء میں کی گئی دو تقاریر کا مجموعہ

مترجم: سید عقیل حیدر زیدی

فہرست

پیش گفتار ۷

مقدمہ ۱۱

واقعۂ عاشورا کا صحیح ادراک ۱۷

واقعۂ کربلا کی تبیین کے دو انداز ۲۰

انبیائے الٰہی علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ۲۳

ایک اسلامی اور فلاحی معاشرے کی تشکیل ۲۷

انحراف و بیگاڑ کی صورت میں وظیفہ کیا ہے؟ ۲۹

انحراف و بیگاڑ کا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث میں بیان ۳۴

اِس انحراف و بیگاڑ کے مدِّمقابل کون قیام کرے؟ ۳۹

وظیفے کی انجام دہی میں علماء و مؤرّخین کے نظریات ۴۳

قیامِ امام حسین علیہ السلام کا بنیادی ہدف و مقصد ۴۷

وظیفے کی انجام دہی میں دوسروں کو دعوت ۵۶

مکہ سے کوفہ روانگی اور راستے میں حرّ کا حائل ہو جانا ۶۲

اسلامی ملکوں کی موجودہ صورتِ حال ۷۱

اسلامی انقلاب، قیامِ امام حسین علیہ السلام کا پرتو ۷۶

امام حسین علیہ السلام کا فاتحانہ اور جرأت مندانہ انداز ۷۹
حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام کا کردار ۸۵
علمی مقابلہ ۹۵
سوالات ۹۷
جواب نامہ ۱۰۰

پیش گفتار

عَنْ عَبْدِ السَّلَامِ الْهَرَوِيِّ، عَنِ الرِّضَا علیہ السلام، قَالَ:

«رَحِمَ اللَّهُ عَبْداً أَحْيَا أَمْرَنَا»، قُلْتُ: كَيْفَ يُحْيِي أَمْرَكُمْ؟ قَالَ: «يَتَعَلَّمُ عُلُومَنَا وَ يُعَلِّمُهَا النَّاسَ، فَإِنَّ النَّاسَ لَوْ عَلِمُوا مَحَاسِنَ كَلَامِنَا لَاتَّبَعُونَا».

(عیون اخبار الرضا علیہ السلام ، ج ۱، ص ۳۰۷)

جناب عبدالسلام بن صالح ہرویؒ (اباصلتؒ) روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت امام رضا علیہ السلام کے محضرِ مبارک میں تھا تب حضرتؑ نے ارشاد فرمایا:

”خداوند عالم اس شخص پر رحم فرمائے جو ہمارے امر (مکتب اہلِ بیتؑ اور تشیّع) کو زندہ کرتا ہے“۔ راوی کہتے ہیں: میں نے پوچھا: (مولاؑ) آپؑ کا امر کس طرح زندہ کرے؟ امامؑ نے فرمایا: ”ہمارے علوم و معارف کو سیکھے اور دوسرے لوگوں کو سیکھائے؛ کیونکہ اگر لوگ ہمارے کلام کی خوبصورتی کو جان لیں تو ضرور ہماری پیروی کریں گے۔“

خداوند بزرگ و برتر کے ہم انسانوں پر الطاف میں سے ایک لطف یہ ہے کہ اُس نے ہمارے درمیان ائمہ معصومین علیہم السلام کو قرار دیا ہے تاکہ ان معصوم ہستیوںؑ کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ہم معنوی و الٰہی زندگی گزارنے کا طریقہ سیکھیں اور اُن کی مفید فرمائشات پر عمل کرکے ابدی سعادت کا سامان کر سکیں۔

سر زمین مشہد مقدس بہشت کا وہ ٹکڑا ہے جس نے رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند اور آسمان امامت و ولایت کے آٹھویں درخشاں ستارے کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے اور ہر سال ایران اسلامی اور دنیا بھر سے لاکھوں عقیدت مند زائرین اس ملکوتی بارگاہ کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں تاکہ اپنے تشنہ لب نفوس کو معارف اہل بیت علیہم السلام کے زُلال و خالص چشمے سے سیراب کریں۔

اس بارگاہِ منورہ کے خدمتگزاروں کے مجموعے ''آستان قدس رضوی'' کا ہر ایک فرد کسی نہ کسی طرح حضرت امام رضا علیہ السلام کے زائرین گرامی کی خدمت میں مشغول ہے تاکہ وہ اطمینانِ خاطر اور آسودگی کے ساتھ زیارت کے فریضے کو انجام دے سکیں اور اس آسمانی و نورانی بارگاہ سے مکمل طور پر بہرہ مند ہو سکیں۔ اسی سلسلے میں ''آستان قدس رضوی کی مدیریت زائرین غیرایرانی'' نے بھی ہمیشہ کوشش کی ہے کہ مختلف اندازسے اہلِ بیت علیہم السلام اور بالخصوص حضرت امام رضا علیہ السلام کی راہ و روش اور سیرت و زندگی کو اس مکتب کے دوستوں اور چاہنے والوں کے لیے پیش کرے۔

اس مدیریت زائرین غیرایرانی کے تمام اقدامات، انقلاب اسلامی کے رہبر فرزانہ حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای دام ظلہ العالی کی فرمائشات کو تحقّق بخشنے، آستان قدس رضوی کے محترم متولی کے اوامر کو بجالانے، آستان قدس رضوی کے بیس سالہ نصب العین کی سند کو تطبیق دینے اور غیرایرانی زائرین کی بصیرت افزائی اور معنوی رُشد و ارتقاء کی ضرورتوں کے پیشِ نظر اسلامی فرہنگ و ثقافت اور تمدن کو فروغ دینے کی غرض سے کیے گئے ہیں۔

حضرت امام رضا علیہ السلام کے غیرایرانی زائرین کی خدمت رسانی کے سلسلے میں اس ادارے کی بین الاقوامی سطح پر کی جانے والی کوششوں کے کچھ نمونے

درج ذیل ہیں: مخصوص ثقافتی پروگراموں کا انعقاد، حلقہ ہائے معرفت، تخصّصی اجلاس، علمی سیمینارز، تعلیمی کلاسز اور ورکشاپس، علمی و ثقافتی مقابلہ جات، شب ہائے شعر، مشرف بہ اسلام ہونے کے مراسم، مہارت دینے اور ہم فکری کے جلسات، خطوط کے جوابات، دنیا بھر کے گوشے گوشے میں کتابوں اور ثقافتی پروڈیکٹس کی ترسیل، شرعی اور اعتقادی سوالات کی جوابدہی، انٹرنیٹ کے ذریعے رضوی ٹاک پر بحث و مذاکرہ اور خالص اسلامی معارف کا دنیا کی مختلف رائج اور زندہ زبانوں میں تالیف و ترجمہ کرکے شائع کرنا۔

عصر حاضر میں اسلام کی آواز دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ رہی ہے تاکہ دُور دراز کے درماندہ اور اپنی اصل کو فراموش کر دینے والے انسانوں کو بھی اُن کی حقیقت کی طرف پلٹائے اور اسلام طلبی و حق کے متلاشی دلوں کا بلند اور انسان ساز معارف کی طرف رجحان، سارے جہان میں بڑی تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ اُمید ہے کہ عصر حاضر میں اس کتاب کا مطالعہ حق جویان کے لیے مفید واقع ہوگا اور اہل بیت عصمت و طہارت علیہم السلام کے زائرین اور چاہنے والوں کی معرفت بڑھانے میں مؤثر اقدام قرار پائے گا اور پروردگار عالم کی رضایت حاصل کرے گا۔

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ وَالِ مُحَمَّدٍ وَمَتِّعْنی بِهُدًی صالِحٍ لا اَسْتَبْدِلُ بِهِ وَطَریقَةِ حَقٍّ لا اَزیغُ عَنْهاوَنِیَّةِ رُشْدٍ لااَشُكُّ فیها وَعَمِّرْنی ما كانَ عُمْری بِذْلَةً فی طاعَتِكَ"[1]

---

۱. صحیفہ سجادیہ کی پہلی دعا سے ماخوذ۔

پروردگارا! محمد و آل محمد علیہم السلام پر درود و سلام بھیج اور مجھے ہدایت کے ایسے شائستہ راستے کی راہنمائی فرما کہ میں اس کے علاوہ کسی اور راستے کی خواہش نہ کروں اور مجھے ایسے حق کے راستے کی راہنمائی فرما کہ میں اس سے (باطل کی طرف) رُخ نہ پھیروں اور مجھے ایسی کامل نیت عطا فرما کہ میں اس میں (کسی قسم کا) شک نہ کروں اور مجھے ایسی طولانی عمر عنایت فرما کہ جسے میں تیری اطاعت و بندگی میں صرف کروں۔

مقدمہ

تاریخ اسلام ایک ایسا خاص اور اہم موضوع ہے جس کا رہبر معظمِ انقلابِ اسلامی حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای (حفظہ اللہ) بےمثال مہارت و تسلّط اور بڑی جرأت و بےباکی کے ساتھ تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں۔ آپ کا تاریخ اسلام کے واقعات کو بیان کرنے کا انداز، صرف اس طرح نہیں ہے کہ قدم بہ قدم اور بالشت بہ بالشت ان واقعات کو ذکر کریں-اگرچہ آپ یہ انداز بھی رکھتے ہیں-لیکن آپ کی اصل مہارت اور خوبصورتی یہ ہے کہ تاریخی واقعات و حوادث کو جاذبِ نظر اور منظّم انداز سے ترتیب دینے کے ساتھ، ان کی دقیق گہری اور آج کل کی ضرورت و نیاز کے مطابق موزوں و متناسب تحلیل بھی پیش کرتے ہیں۔ آپ کا تاریخ اسلام کی تحلیل کرنے میں تبحُّر و مہارت اس قدر زیادہ ہے کہ آپ تمام ائمہ معصومین علیہم السلام کے اَدوارِ زندگی کو ''ڈھائی سو سالہ انسان''[1] کے عنوان سے تعبیر کرتے ہوئے، اسے ایک نظر سے دیکھتے ہیں اور اس عظیم عمارت کے تجزیہ و تحلیل کرنے (اور اسے ائمہ اطہار علیہم السلام کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی کے طور پر پیش کرنے) میں انتہائی دقیق اور ماہر صاحبِ نظر اور تحلیل گروں میں سے شمار ہوتے ہیں۔

تاریخ کے اس عظیم ترین قیام، یعنی قیامِ حضرت ابا عبد اللہ الحسین علیہ السلام کی تحقیق، ایک ایسا اہم موضوع ہے جس کے مختلف زاویوں اور پہلوؤں پر بہت سے اسلام شناس اور مؤرّخین نے بحث کی ہے۔ ''قیامِ امام حسین علیہ السلام

---

۱ ۔ رہبر معظم انقلابِ اسلامی کی ارزشمند کتاب ''انسان ۲۵۰ سالہ '' کو آستان قدس رضوی کے ادارۂ مدیریت زائرین غیر ایرانی کی طرف سے ہر معصوم علیہ السلام کی زندگی کی مناسبت سے علیحدہ علیحدہ شائع کیا جا رہا ہے۔

کے علل و اسباب'' اِس موضوع کا ایسا عنوان ہے، جس نے زمانۂ معاصر میں بالخصوص، بڑے بڑے دانشوروں اور علماء کے اذہان کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور اِس بارے میں مختلف نظریات پیش کیے گئے ہیں۔

رہبر معظم انقلابِ اسلامی ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی تحریک سے سو سے زیادہ ایسے اہم دروس اُخذ کیے جا سکتے ہیں جن میں سے ہر ایک درس معاشرے کی تربیت اور اصلاح کے لیے ایک راہنما اصول بن سکتا ہے۔ آپ نے اِن دروس میں سے چند اہم موضوعات کو (نمونہ کے طور پر) بیان کیا ہے، جیسے: عاشورا کی مختصر مدّت اور طولانی مدّت میں حاصل ہونے والی کامیابیاں؛ اُس زمانے میں معاشرے کی اوضاع و شرائط؛ عاشورا کی عبرتیں اور اسباق؛ ظالم، مظلوم اور منظلِم (ظلم دیکھ کر خاموش رہنے والا) میں افراد کی تقسیم؛ عاشورا کے پیغامات اور دروس؛ حسینیؑ مصائب و آلام کے مختلف پہلو؛ عوام اور خواصّ کا کردار؛ قیامِ حسینیؑ اور انقلابِ خمینیؒ میں مقائسہ اور تقابُل؛ عاشورا کی عرفانی اور معنوی تجلیاں؛ شہدائے کربلا کی قدر و قیمت اور اہمیت اور عاشورا کے جاودانی اسرار و رُموز؛ ایسے موضوعات میں سے ہیں جنہیں رہبر معظم انقلابِ اسلامی نے اپنی تقاریر اور خطبوں میں بیان کیا ہے اور یہ ایک گفتگو اور کتاب کی صورت میں پیش کیے جانے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ تمام مذکورہ دروس ایک طرف، درحقیقت اِن میں سے ایک درس اصلی اور حقیقی ہے اور باقی دروس حاشیے کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ ایک اصلی درس یہ ہے کہ: ''امام حسین علیہ السلام نے کیوں قیام فرمایا تھا؟''

رہبر معظمِ انقلاب کی تمام جمع آوری شدہ تقاریر اور خطبوں میں، سال ۱۹۸۲ء وہ سب سے پہلا موقعہ تھا جب آپ نے تفصیلی طور پر قیامِ امام

حسین علیہ السلام کے علل و اسباب پر روشنی ڈالی، البتہ آپ اس تقریر میں فرماتے ہیں کہ ہم اسی قسم کی گفتگو انقلاب سے پہلے، اُس شہنشاہی ظلم و جبر اور گھٹن زدہ ماحول میں بھی، داستانوں اور مثالوں کی صورت میں بیان کیا کرتے تھے۔

''قیامِ امام حسین علیہ السلام کے علل و اسباب'' کے بارے میں جو تجزیہ و تحلیل رہبر معظم انقلابِ اسلامی پیش کرتے ہیں، وہ اس قدر جاذبِ نظر، خوبصورت، منطقی، دقیق اور قابلِ استفادہ ہے کہ طے پایا ہے کہ ''سلسلہ گفتارہای صہباء'' کی پانچویں گفتگو ''قیامِ حسینیؑ'' کے عنوان سے مخصوص کی جائے۔ رہبر معظمِ انقلاب اس تقریر کے علاوہ، سال ۱۹۸۴ء اور سال۱۹۹۵ء میں بھی اسی موضوع کی مناسبت سے دو اہم تقاریر فرما چکے ہیں۔ آپ کی سال۱۹۹۵ء کی تقریر''ڈھائی سو سالہ انسان'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ اس لیے طے پایا ہے کہ دوسری دو تقاریر کی بنیاد پر کام کیا جائے (اور کتابی شکل میں پیش کیا جائے۔) البتہ آپ کی سال ۱۹۸۲ء کی تقریر وضاحت اور تجزیہ و تحلیل میں زیادہ قوی ہے اور دوسری (یعنی سال ۱۹۸۴ء کی) تقریر مثالوں اور تاریخی روایات پر مشتمل ہے۔

دونوں تقاریر کے مطالب کلی طور پر تو ایک ہی ہیں، لیکن اس کے باوجود مطالب کی بہت ہی کم تکرار ہوئی ہے اور ان دونوں تقاریر کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کیا جا سکتا ہے؛ لیکن دونوں تقاریر میں کلی بحث کے تسلسل اور نظم کا لحاظ رکھتے ہوئے، ذہن میں آیا کہ اِن دونوں تقاریر کو یکجا کرکے، ایک مکمل اور موضوع سے متناسب تقریر تیار کی جائے، اس طرح سے کہ ضرورت کے وقت دونوں تقاریر کے انضمام سے مدد لیتے ہوئے گفتگو کو مکمل کیا جائے اور کوئی پہلو تشنہ بھی نہ رہے۔

اس روش کے لیے «مقارنة» کے لفظ کو اختیار کیا گیا ہے لفظِ «مقارنة» عربی لغت کی کتابوں میں مختلف معانی رکھتا ہے۔ «منتهی الأرب فی لغة العرب» نامی کتاب میں اس لفظ کے ذیل میں آیا ہے: ''دو کھجور کے دانوں کو ایک دوسرے کے اُوپر رکھ کر تناول کرنا۔'' ایک روایت میں ہے کہ کھجور الٰہی نعمتوں میں سے ایک مبارک ترین نعمت ہے، کیونکہ یہ سالن بھی اور روٹی بھی۔ (یعنی یہ ایک مکمل غذا ہے۔) اس لیے اس گفتگو سے کتاب تیار کرنے اور عنوان دینے میں اسی لفظِ «مقارنة» سے استفادہ کیا گیا ہے۔[1]

رہبر معظم انقلابِ اسلامی کی پہلی تقریر مؤرخہ ۱۹۸۲/۰۶/۲۹ء کو خاکستری رنگ کے ساتھ اور دوسری تقریر مؤرخہ ۱۹۸۴/۱۰/۱۲ء کو سیاہ رنگ کے ساتھ مشخص کیا گیا ہے۔ ان میں ماسوائے گفتاری زبان کو نوشتاری و کتابی زبان کے انداز میں تبدیل کرنے کی ضرورت کے لحاظ سے - اگرچہ رہبر معظم کے بیانات اور گفتگو میں ایسے موارد انتہائی کم ہیں – اصلی متن میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے اور رہبر معظم کے اصلی اور عین بیانات کو ہی شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کے مطالب کے مفہوم کا لحاظ اور تعلق برقرار رکھتے ہوئے، بہت ہی کم موارد میں، وہ مطالب جو ہمارے موضوعِ بحث سے براہِ راست تعلق نہیں رکھتے تھے یا وہ مطالب جو دو تقاریر کے باہمی انضمام اور یکجا کرنے کی وجہ سے تکراری تھے، ایسے مطالب کو حذف کر دیا گیا ہے اور انہیں (۔۔۔) علامت کے ساتھ مشخص و معیّن کیا گیا ہے۔اگر رہبرِ معظّم کی تقریر میں ''علیہ السلام'' یا اس کے مشابہ تعبیرات استعمال ہوئی ہیں، جیسے: ''حضرت'' اور ''امام'' وغیرہ، تو اردو زبان قارئین کا لحاظ رکھتے ہوئے، ائمہ

۱۔ ''گفتارہای صہباء'' کی تیسری گفتار جو ''جریانِ روشن فکریِ اسلامی در ایران'' کے عنوان سے ہے، اس میں بھی اسی روش پر کام کیا گیا ہے۔

طاہرین علیہم السلام کے پورے نام اور ''علیہ السلام ؛ علیہما السلام ؛علیہم السلام اور علیہا السلام'' جیسی تعبیرات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ (مترجم)

تقریباً جہاں بھی رہبر معظم انقلابِ اسلامی (مدّظلّہ العالی) قیامِ امام حسین علیہ السلام کے علل و اسباب کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، تو (ایران کے) انقلابِ اسلامی کی طرف بھی اشارہ فرماتے ہیں؛ جیسے: '' ہماری ملت نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی طرح کام کیا ہے اور اپنے حسینِ زمان، عزیز و بزرگوار امامِ اُمت (قدس سرّہ) کے (فرامین پر عمل کرتے ہوئے اُن کے) پیچھے چلی ہے۔'' یا جیسے: ''انقلاب (اسلامی) کی کامیابی و کامرانی کے ساتھ، مومن اور مخلص مسلمانوں کی فاسد (اور ظالم) نظاموں کے مقابلے میں چودہ سو سالہ آرزوؤں کی تکمیل ہوئی ہے۔'' یا جیسے: ''ہم ابھی اپنی اس جدّ و جہد اور تلاش و کوشش کو پورا نہیں سمجھتے، ہم ابھی اس حسینی تحریک کو اپنے معاشرے میں مکمل اور ختم شدہ خیال نہیں کرتے۔ ہم ابھی کربلا اور عاشورا کے راستے میں مسلسل گامزن ہیں۔'' پس اب بھی رہبر معظم انقلابِ اسلامی اور عالم اسلامی کے سپہ سالار اور کمانڈر انچیف کو باوفا، سچے، مخلص، جانثار اور مطیع و فرمانبردار ساتھیوں کی ضرورت ہے، مختصر یہ کہ آپ کو ایسے عاشورائی افراد چاہییں جو یزیدِ وقت کے مدِّمقابل ٹھہر سکیں اور یہ تحریک جو اسلام کے دوبارہ احیاء، بیداری اور مکمل طور پر اسلامی نظام کی برقراری کے لیے شروع ہوئی ہے، اسے بالآخر مہدی موعود علیہ السلام سے ملحق کریں۔ ان شاء اللہ

محرم الحرام۱۴۳۶ھ ق؛ نومبر ۲۰۱۴ ء

بسم اللہ الرّحمن الرّحیم

اَلسَّلامُ عَلَیکُم وَرَحمَۃُ اللہ

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العالَمین، اَلحَمدُ لِلّٰہِ عَلی نِعَمِہِ کُلِّھا وَالحَمدُ لِلّٰہِ بِمَحامِدِہِ کُلِّھا، اَحمَدُہُ وَ اَستَعینُہُ وَ اَستَغفِرُہُ وَ أَتَوَکَّلُ عَلَیہِ وَ أُصَلّی وَ أُسَلِّمُ عَلی حَبیبِہِ وَ نَجیبِہِ وَ خِیَرَتِہِ فی خَلقِہِ، حافِظِ سِرِّہِ وَ مُبَلِّغِ رَسالاتِہِ، بَشیرِ رَحمَتِہِ وَ نَذیرِ نِقمَتِہِ، سَیِّدِنا وَ نَبیِّنا اَبِی القاسِمِ مُحَمَّدٍ، وَ عَلی اَھلِ بَیتِہِ الطَّیِّبینَ الطّاھِرینَ المَعصومینَ، سیَما بَقیَّۃِ اللہِ فِی الاَرَضینَ وَ عَلی اَئمَّۃِ المُسامِینَ وَ حُماۃِ المُستَضعَفینَ وَ ھُداۃِ المُؤمِنینَ. قالَ اللہُ الحَکیمُ فی کِتابِہِ: «وَجَعَلناھُم اَئِمَّۃً یَھدونَ بِاَمرِنا وَاَوحَینا اِلَیھِم فِعلَ الخَیراتِ وَ اِقامَ الصَّلاۃِ وَ ایتاءَ الزَّکاۃِ وَ کانوا لَنا عابِدینَ»[۱]

واقعۂ عاشورا کا صحیح ادراک

بہت مناسب ہے کہ ہم آج کی اپنی اِس گفتگو کو محرم الحرام کے تاریخی اور دلسوز حوادث و واقعات سے پُر اِن ایام کی مناسب سے، حضرت ابا عبد اللہ امام حسین علیہ السلام کے تاریخی اور ناقابلِ فراموش قیام کے بارے میں قرار دیں اور تاریخ کے اس استثنائی اور منفرد واقعے کے بارے میں، کہ نہ اس

۱۔ ”اور ہم نے ان سب کو ایسا پیشوا قرار دیا ہے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کی طرف کارخیر کرنے، نماز قائم کرنے اور زکات ادا کرنے کی وحی کی اور وہ سب ہمارے عبادت گزار بندے تھے۔“ ؛ (سورۂ مبارکہ انبیاء، آیت ۷۳)۔

سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد، حتی کہ آج تک کوئی بھی واقعہ اتنی عظمت اور اتنی تاثیر کے ساتھ پورے عالم میں رونما نہیں ہوا ہے، کچھ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ گفتگو کریں۔ حقیقت و واقعیت یہ ہے کہ ابھی تک اِس عظیم اور حیرت انگیز واقعے کے تمام پہلو اور جوانب دنیا والوں کے لیے واضح اور روشن نہیں ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے بھی یہ (عظیم) واقعہ ابھی تک شناختہ شدہ نہیں ہے؛ حتی کہ خود ہماری ملت کے لیے بھی جو امام حسینؑ سے پہچانی جاتی ہے اور حسین ابن علی علیہما السلام کی یاد اور عاشورا و محرم کا ناقابلِ فراموش واقعہ، ہماری قوم و ملت کی سنّتوں اور آداب و رسوم کا ایک لازمی جزوّ ہے اور صدیوں سے (یہ چیز ہماری قوم اور) ہمارے لوگوں سے جدا نہیں ہوئی ہے؛ اس کے باوجود ہمارے لوگوں کے درمیان بھی یہ واقعہ مکمل اور واضح طور پر شناختہ شدہ نہیں ہے۔ اگرچہ الحمد للہ لوگوں کی آگاہی اور خصوصاً آخری سالوں میں انقلابی تحریک کے ساتھ، اِن آخری بیس (۲۰) سالوں میں، عاشورا (اور قیامِ امام حسین علیہ السلام) کے بارے میں نئی اور اہم باتیں بھی کی گئی ہیں اور متفکرین، دانشوروں، مصنّفین نے اور اُن لوگوں نے جنہوں نے اس واقعے کو دقتِ نظر اور پوری توجہ سے دیکھا ہے، بہت سے مطالب بیان کیے ہیں، جس کی وجہ سے اس واقعے سے بڑی حد تک غبار چھٹ گیا ہے؛ لیکن پھر بھی بحث و گفتگو (اور تجزیہ و تحلیل) کی گنجائش موجود ہے۔ باوجود اس کے کہ ایک ہزار تین سو چالیس سال سے زائد عرصہ واقعۂ عاشورا کو رونما ہوئے گزر چکا ہے، لیکن ہماری تاریخ میں اور شاید پوری بشریت کی تاریخ میں، یہ واقعہ ابھی تک باعظمت ترین اور پُر معنی ترین واقعات میں سے ہے کہ جو جانثاری، فداکاری اور خون کی تحریر کے ساتھ رونما ہوا ہے۔ واقعۂ عاشورا کے بعد ہماری پوری تاریخ میں، شاید

ہی کوئی ایسی تحریک، قیام یا خونین واقعہ تلاش کیا جا سکے جو انسانی اہداف و مقاصد اور آرمانوں کی تکمیل کے لیے برپا ہوا ہو اور اُس نے واقعۂ عاشورا کو اپنے لیے آئیڈیل اور نمونۂ عمل قرار نہ دیا ہو۔ دوسرے تمام حوادث و واقعات کے برخلاف جو اپنے رونما ہوتے وقت ایک طلاطم برپا کرتے ہیں، لیکن جتنا زمانہ گزرتا جاتا ہے یہ طلاطم اور جوش و جذبہ ضعیف اور ماند پڑتا چلا جاتا ہے؛ جبکہ واقعۂ عاشورا کو رونما ہوئے اب تک جتنا زمانہ بھی گزرا ہے، ہر سال اور ہر زمانے میں اس کی شدّت و حِدّت میں اضافہ ہی ہوا ہے اور سب تک اس کے اثرات پہنچے ہیں۔

وہ مسئلہ جو یہاں ہمارے لیے قابلِ اہمیت ہے، یہ ہے کہ ہم اِس واقعے کے مقصد اور اِس تحریک و قیام کے مفہوم کو صحیح طور پر سمجھیں؛ کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے -اور حقیقت بھی یہی ہے - کہ ہمارے اِس انقلاب نے اِس واقعے سے الہام لیا ہے اور اسی واقعے کے ذریعے سے راہنمائی حاصل کی ہے۔ امامِ راحلؒ نے فرمایا تھا: ''محرم وہ مہینہ ہے جس میں خون تلوار پر کامیاب ہوا ہے۔'' اور وہ محرم (کا مہینہ) جس میں امامؒ نے یہ بات فرمائی تھی، ایک تاریخی اور سرنوشت ساز محرم بن گیا تھا۔ یہ گفتگو اور یہ حقیقت ایک ہی ثقافت سے سیراب ہوئی ہیں؛ حقیقت بھی اسی طرح ہے کہ ہم اپنے اِس انقلاب کو واقعۂ عاشورا کی برکات اور آثار میں سے سمجھتے ہیں۔

انقلابِ اسلامی کی کامیابی کے بعد بھی ہم نے جو روش اختیار کی، عالمی استکباری طاقتوں کے ساتھ مقابلے میں، ان کی استعماری و تخریب کنندہ سیاستوں کے مقابلے میں، وہ بھی سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ و السّلام کے قیام سے الہام لیا ہے۔ ہمارے جوان عشقِ حسینؑ اور یادِ حسینؑ

سے سرشار جنگ کے میدانوں میں حاضر ہوئے اور ہمارا انقلاب آج تک اِن ہی سختیوں اور دُشواریوں کے ساتھ آگے بڑھا ہے اور اس کے بعد بھی ان شاء اللہ آگے بڑھے گا۔ پس ضروری ہے کہ ہم اِس واقعہ (عاشورا) کو خوب اچھی طرح سے سمجھیں۔

واقعۂ کربلا کی تبیین کے دو انداز

واقعۂ کربلا کو دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے؛ ایک تاریخی واقعات کے بیان کرنے کے ساتھ کہ خود اِن واقعات کا بیان کرنا بھی اپنے ہمراہ بہت سے پیغامات رکھتا ہے۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام (کی شہادت) کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنی دس سالہ طولانی پُر رنج و غم زندگی کس طرح گزاری؟ آپؑ کی راہ و رفتار اور سیرت کیا رہی؟ آپؑ کو کس طرح کے خطوط لکھے گئے اور آپؑ نے ان خطوط کا کیا جواب دیا؛ یزید کے مسندِ خلافت پر براجمان ہونے کے بعد آپؑ نے کونسا عکس العمل ظاہر کیا؛ پھر اس کے بعد جب مدینہ منورہ سے روانہ ہونے لگے تو شہرِ مدینہ میں کونسے حوادث و واقعات پیش آئے؛ جب مکہ مکرمہ پہنچے تو وہاں کن واقعات کا سامنا کرنا پڑا اور جب مکہ سے (حج کا احرام توڑ کر کوفہ یا کربلا کے ارادے سے) نکلے تو ہر ہر منزل اور مقام پر کون کونسے واقعات رونما ہوئے؛ یہ واقعۂ عاشورا کی ایک قسم کو بیان کرنا ہے اور معمولاً اسی طرح بیان بھی کیا جاتا ہے۔ خود اس طرح کا بیان کرنا بھی بہت سے پیغامات (اور دروس) کا حامل ہوتا ہے، البتہ اگر بنیاد اس بات پر رکھی جائے کہ اس قسم کو بیان کرنا چاہیے تو پھر تفصیل سے بیان کیا جانا چاہیے، لیکن ہم نہیں چاہتے کہ اِس وقت تفصیل سے اِس مسئلے

کے بارے میں گفتگو کریں۔

دوسری قسم، واقعۂ کربلا کی جمع بندی اور جمع آوری ہے؛ تمام اُن واقعات و حوادث کی جمع بندی اور تمام اُن فرامین و فرمودات کی جمع بندی کہ جن کے مجموعے سے ہم یہ سمجھیں اور نتیجہ اخذ کریں کہ سید الشہداءعلیہ السلام نے کیوں قیام فرمایا تھا؟ میں ترجیح دیتا ہوں کہ آج میں (اپنی اس گفتگو میں) اِس بارے میں بات کروں، البتہ اس دوسری قسم کے بارے میں بھی اگر تفصیلی طور پر گفتگو کرنا چاہیں تو (کم از کم) دو تین گھنٹے کا وقت درکار ہوگا؛ لیکن پھر بھی میں ترجیح دوں گا کہ اپنی اس گفتگو کو ایک گھنٹے کے اندر مکمل کروں۔

ابتداء میں پہلے ایک مقدّمہ بیان کروں پھر اس کے بعد واقعۂ کربلا کے مفہوم پر روشنی ڈالوں گا۔ جیسا کہ بہت سی نشستوں میں، کئی نماز جمعہ کے خطبوں میں، اسلام اور دوسری شریعتوں کی نظر سے حقِ حکومت کے بارے میں، میں نے اپنے بھائیوں اور بہنوں کی خدمت میں عرض کیا[1]، کہ ادیانِ الٰہی میں حکومت کی اساس اور بنیاد، اُس مفہوم سے جو حکومت کے بارے میں دنیا طلب، قدرت پسند اور سوءِ استفادہ چاہنے والے لیتے ہیں، مختلف اور متفاوت ہے۔ دنیا طلب افراد حکومت کو لوگوں پر حاکمیتِ مطلق اور اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ اس میں فرق نہیں ہے کہ خواہ وہ حکمران باتدبیر، باصلاحیت اور بااستعداد ہوں، ان کا نام تاریخ میں اچھے الفاظ سے، یعنی قدرت و عظمت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہو؛ حتی کہ وہ حکمران بھی جن کا نام غلطی سے عدل و انصاف کے عنوان سے باقی رہ

۱۔ نماز جمعہ کے اِن خطبوں کا سلسلہ کتاب ''ولایت و حکومت'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

گیا ہے اور خواہ وہ بادشاہ و سلاطین ہوں کہ جو قدرت و عظمت، لیاقت و شائستگی اور اقتدار کے حوالے سے شہرت بھی نہیں رکھتے تھے، جو بےلیاقت، آسیب پذیر اور شورشوں، بغاوتوں، حملوں اور زمانے کی سختیوں کے مقابلے میں راہِ فرار اختیار کرنے والے تھے، یہ سب کے سب اس جہت میں مشترک تھے کہ لوگوں پر حکومت کو اپنے لیے آرام و سکون، عیش و عشرت اور عیاشی کا ذریعہ سمجھتے اور قرار دیتے تھے۔ آج بھی دنیا میں اسی طرح سے ہے؛ وہ شخص جو حکومت (اور اقتدار) تک پہنچ جاتا ہے یہ احساس کرتا ہے کہ اس نے ایک آرام دہ اور ناز و نعم سے بھری زندگی کو حاصل کر لیا ہے۔ تقریباً ساری دنیا میں ہی سوائے چند انگشت شمار استثنائی موارد کے، کہا جا سکتا ہے کہ مسئلہ اسی طرح سے ہے۔

لیکن اسلام اور ادیان کی فرہنگ و ثقافت میں، حکومت ایک واجب و فریضۂ الٰہی، وظیفے اور سخت و پُرخطر اور محرومیت سے بھرپور ماموریت و ذمہ داری کے معنی میں اور اجتماعی ذمہ داریوں کے سنگین ترین بوجھ اُٹھانے کے معنی میں ہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ جو شخص حکومت (اور اقتدار) کو حاصل کر لے، وہ اپنے لیے کسی چیز کا خواہاں ہو؛ بندگانِ خدا کو اپنے اقتدار کے پنجے میں اسیر کرے یا اسیر کرنے کے درپے ہو، مالِ خدا (اور بیت المال) کو اپنے عیش و نوش کے رنگین دسترخوان پر مزید اضافہ کا باعث سمجھے اور اس سے (بلا ضرورت) استفادہ کرے؛ مسئلہ یہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسے دنیا کے تمام اقتداروں کی عرف میں، سلطنت، بادشاہت اور ملوکیت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسلامی اصطلاح میں اس کا نام ''امامت'' ہے، اس کا نام ''خلافۃ اللہ'' ہے، اس کا نام لوگوں کے اُمور کی ولایت اور اس کا عہدہ دار ہونا ہے؛ یعنی حکومت کے نام میں بھی حتی کہ وظیفہ اور مسئولیت کی

طرف اشارہ ہے۔ پیغمبر اکرمﷺ نے اجتماعی نظام (کی تبدیلی) اور لوگوں کی زندگی کے بارے میں جو عظیم ترین تحریک چلائی، وہ بھی اسی سے عبارت تھی کہ لوگوں کو طاغوت اور ظالم و جابر حکمرانوں سے نجات دلائیں اور انہیں اپنی خدائی ولایت، امامت اور رہبری کے سائے تلے بندۂ خدا بنائیں: «الدُّعاءُ اِلی طاعَةِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ مِن طاعَةِ العِبادِ وَاِلی عِبادَةِ اللهِ مِن عِبادةِ العِبادِ»[1] جیسا کہ حضرت امام محمد باقرؑ سے مروی ایک روایت میں ہے؛ لوگوں کو بندوں کی عبادت اور غلامی سے اور وہ انسان جو خود خدا وند متعال کے بندے اور غلام ہیں اور بلا وجہ دوسرے لوگوں کو اپنا غلام بناتے ہیں، پیغمبر اکرمﷺ نے نجات دی اور انہیں ولایتِ الٰہی کی چھتری تلے لے گئے، کیونکہ انسانوں کے لیے بلند و ارفع ترین آزادی، عزّت اور عظمت اسی ولایت کے سائے میں میسر ہے۔

انبیائے الٰہیؑ کی بعثت کا مقصد

پروردگارِ عالم کے تمام انبیائے عظامؑ منجملہ ہمارے بزرگوار پیغمبر اسلامﷺ جب مبعوث بہ رسالت ہوئے تو درحقیقت وہ سب کے سب اس کوشش میں تھے کہ انسانوں کے لیے ایک جدید زندگی کی منصوبہ بندی کریں اور یہ چاہتے تھے کہ خود اپنی ہی حیاتِ طیّبہ کے دوران، اگر ممکن ہو تو قدرتِ الٰہی کو بروئے کار لاتے ہوئے، اس نئی زندگی کے تمام اطراف و جوانب کو جو ضروری اور ناگزیر ہیں، محقّق کریں۔ اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ انبیائے الٰہیؑ صرف لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنے کے لیے

۱۔ کافی، کتاب الجہاد، باب فضل الجہاد، حدیث ۴۔

تشریف لائے تھے، تو وہ اشتباہ کا شکار ہے۔ انبیائے الٰہی علیہم السلام صرف نصیحت کرنے، درس دینے اور لوگوں کے اذہان کو جلاء بخشنے کے لیے مبعوث نہیں ہوئے تھے؛ یہ انبیائے الٰہی علیہم السلام کے دیگر کاموں میں سے ایک کام ہے، اُن کی مسئولیت اور ماموریت کا ایک حصّہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی کلی اور اصلی ماموریت اور ذمہ داری یہ ہے کہ ایسے معاشرے اور ایسی دنیا کو تشکیل دیں کہ یہ جدید معاشرہ اور نئی دنیا پروردگارِ عالم کے قوانین کے مطابق وجود میں آئی اور بنائی گئی ہو۔

انبیائے الٰہی علیہم السلام کی تمام مشکلات اور راستے کی رکاوٹیں بھی اسی وجہ سے تھیں اگر وہ صرف نصیحت کرنے کے لیے آئے ہوتے، تو بہت سی مشکلات اور سختیاں انبیاءؑ کو پیش ہی نہ آئی ہوتیں۔ یہ جو آپ ملاحظہ کرتے ہیں کہ کتنے ہی انبیائے الٰہی علیہم السلام کو شہید کیا گیا، انہوں نے اپنی زندگی میں کتنی زیادہ سختیاں اور مشکلات جھیلیں اور کس قدر اپنے زمانے کے حکام و سلاطین اور بادشاہوں سے برسرِپیکار رہے، یہ سب اسی خاطر تھا؛ کیونکہ انبیاءؑ چاہتے تھے کہ حکومت اور قدرت کو، غاصب حکام و سلاطین کے ہاتھ سے چھین لیں اور ایسی دنیا تشکیل دیں کہ اس جدید دنیا میں الٰہی احکامات و معارف اور پروردگارِ عالم کے دستورات و قوانین حاکم ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیائے الٰہی علیہم السلام اپنے زمانے کے (ظالم و جابر) حکام و سلاطین کے ساتھ جنگ و مبارزہ آرائی پر مجبور ہو جاتے تھے، بہت سے موارد میں، جیسا کہ قرآن کریم کی آیت کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے: «وَكَأَيِّن مِن نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ»[1] یعنی ”کتنے ہی انبیاءؑ ایسے تھے جن کے ہمرکاب ہو کر بہت سے خدا پرستوں نے طاغوتوں اور سرکشوں کے ساتھ جنگ کی۔“ ایک روایت میں

۱۔ سورۂ مبارکہ آل عمران، آیت۱۴۶۔

ہے کہ پیغمبروںؑ میں سے سب سے پہلے جس نے اپنے ہاتھ میں تلوار اُٹھائی اور جنگ کی، وہ حضرت ابراہیمؑ تھے۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ اِن انبیائے الٰہیؑ کی تاریخ اور سرگذشت ہمارے ہاتھوں میں اور ہماری دسترس میں نہیں ہے۔ جو کچھ ہمارے اختیار میں ہے وہ غالباً تحریف شدہ تاریخ کی کتابیں ہیں یا توریت سے منقول ایسی روایات ہیں، جن میں سے زیادہ تر ناقص اور ناتمام ہیں یا پھر ایسی روایات ہیں جو شفاہاً [1] اور زبانی طور پر نقل ہوئی ہیں اور انہیں بھی صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ کچھ تعداد میں ایسی روایات بھی ہیں جو صحیح ہیں اور اہل بیت اطہارؑ سے منقول ہیں، لیکن یہ روایات بھی انبیاءؑ کی پوری زندگی کو واضح اور روشن نہیں کرتی ہیں۔ «اَوَّلُ مَن قاتَلَ فی سَبیلِ اللّٰهِ اِبراهیمُ» [2] یہ روایت، ایک ایسی حدیث ہے جو ہمارے لیے یہ بیان کرتی ہے کہ وہ پہلے شخص جنہوں نے راہِ خدا میں جنگ کی، حضرت ابراہیمؑ تھے۔ حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان اور حضرت داودؑ سے بھی پہلے، بلکہ اُن تمام انبیائے الٰہیؑ سے پہلے جن کی جنگ اور مبارزہ آرائی کی باتیں ہم نے سنی ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے جنگ کی ہے؛ پیغمبرِ خدا حضرت لوطؑ -جو ظاہراً حضرت ابراہیمؑ کے بھانجے بھی تھے- حضرت ابراہیمؑ کے سرداروں میں سے ایک تھے، حضرت ابراہیمؑ نے انہیں اپنے لشکر کا عَلَم تھمایا اور جنگ کے لیے روانہ کیا۔ ہمارے پیغمبر ختمی مرتبتﷺ بھی جو جنگ و نزاع اور (کفار و مشرکین سے) کشمکش میں مصروف و مشغول ہوئے، اس کی بھی یہی وجہ تھی؛ بصورتِ دیگر جب پیغمبر اکرمﷺ مکہ میں تشریف فرما تھے، اگر صرف (وہاں کے) لوگوں کو

۱۔ ایسی خبر جو زبان زدِ عام ہو لیکن اس کا سچا یا جھوٹا ہونا معلوم نہ ہو۔

۲۔ پیغمبر اکرمﷺ، بحار الانوار، کتاب النبوۃ، ابواب قصص ابراہیمؑ، باب۳، حدیث۱۔

وعظ و نصیحت کرتے تو کسی کا آپؐ سے کوئی جھگڑا ہی نہیں تھا۔ (مثلاً کہتے:) اے لوگو! دوسرے خداؤں کی پرستش نہ کرو، ظلم نہ کرو۔ لوگ (یہ باتیں) سنتے، لیکن ظلم بھی کرتے اور دوسرے خداؤں کی پرستش بھی کرتے۔

بالکل اسی طرح جیسے شہنشاہی طاغوت کے زمانے میں بہت سے لوگ وعظ و نصیحت کرتے تھے، اخلاقی دروس بھی دیتے تھے، لیکن نہ رژیم شہنشاہی اور نہ ہی دوسرے طاغوتوں کو کسی قسم کی ناراحتی و پریشانی کا کوئی احساس ہوتا تھا اور نہ ہی وہ کسی تشویش اور خوف میں مبتلا ہوتے تھے، اصلاً کسی خطرے کا احساس ہی نہیں کرتے تھے۔ کب خطرے کا احساس ہوتا ہے؟ خطرے کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب یہ کہا جائے کہ یہ نظام جو اِس وقت موجود ہے، یہ نظام جس کا سربراہ اور صاحبِ اقتدار شخص طاغوت ہے، اِس کے تمام کارندے اور عمال طاغوت ہیں، یہ ایک (باطل اور) غلط نظام ہے، اس نظام کو تبدیل ہونا چاہیے۔ اس نظام کی تبدیلی سے کیا مراد ہے؟ یعنی یہ سب طاغوتی چلے جائیں، وہ بڑا طاغوت بھی چلا جائے اور تمام وہ راستے اور ذرائع، جو مادی اور معنوی وسائل کو طاغوتیوں کی جیبوں میں ڈالتے ہیں، وہ سب راستے اور ذرائع مسدود ہو جائیں؛ یہ ہے جدید نظام کا معنی۔ قدیمی اور کُہنہ نظام چلا جائے، یعنی یہ کام حتماً ہو جائے؛ لہٰذا یہی وہ وقت ہے جب یہ طاغوتی (اور ظالم و جابر لوگ) اپنے لیے خطرے کا احساس کرتے ہیں اور جنگ کے لیے تیار اور آمادہ ہو جاتے ہیں؛ جیسا کہ ہمارے (اِس اسلامی) انقلاب میں بھی اسی طرح سے تھا؛ لہٰذا آپ نے دیکھا کہ طاغوتی نظام کی حسّاسیت اور نگرانی خاطر امامِ راحل (قدس سرّہ) اور خطِ امام والوں کی نسبت، حقیقتاً سب سے زیادہ تھی، کیوں؟ اس لیے کہ وہ دوسرے انقلابی اور مبارزین جو ظاہری طور پر مبارزہ و جہاد کر رہے تھے، وہ شاہ کے خلاف،

طاغوت کے خلاف اور پورے طاغوتی نظام کے خلاف، کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ کسی ایک خاص کام پر اعتراض کرتے تھے، حکومت کے بارے میں کوئی بات کرتے تھے؛ (لیکن واشگاف الفاظ میں اپنی آوازِ اعتراض بلند نہیں کرتے تھے)۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ امامِ اُمت (قدس سرّہ) اور ان کی پیروی میں، شاہ کے خلاف وہ عظیم مذہبی، روحانی اور عوامی تحریک تیار ہو گئی ہے جو برملا شاہ کے خلاف اظہارِ خیال کرتی ہے، (اپنے اہداف و مقاصد کے حصول کے لیے) جذبہ رکھتی ہے، یہی وہ وقت تھا جب ان کے بارے میں حسّاسیت اور ردِّعمل سب سے زیادہ ہونے لگا اور یہ وہ حقیقت ہے جو موجود تھی اور آج بھی دنیا کے بہت سے مقامات پر پائی جاتی ہے۔

ایک اسلامی اور فلاحی معاشرے کی تشکیل

پس ہم بہ عنوانِ مقدّمہ بیان کرتے ہیں کہ یہ باتیں کلیات کے طور پر آپ کے اذہان میں رہنی چاہییں کہ انبیائے الٰہی علیہم السلام دنیا کو جدید بنانے (اور معاشرے کی اصلاح) کے لیے مبعوث ہوتے رہے؛ جیسا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث بہ رسالت ہوئے اور آپؐ نے ایک جدید دنیا کی بنیاد رکھی۔ آپؐ کا دنیا میں اندازِ حکومت، طاغوتوں کے دنیا میں طرزِ حکومت سے بالکل مختلف تھا۔ اُس زمانے میں دنیا کے کسی بھی مقام پر ایسی حکومت موجود نہیں تھی، جیسی حکومت آنحضرتؐ تشکیل دینا چاہ رہے تھے۔ نہ تو حکومت کی شرائط اور نہ ہی حاکم کی شرائط، دنیا بھر میں مدینۃ النبیؐ جیسی تھیں؛ نہ ہی حاکم کا رعایا سے رابطہ اور تعلق ساری دنیا میں مدینۃ النبیؐ سے کوئی مشابہت رکھتا تھا؛ درحقیقت یہاں کچھ اور تھا اور وہاں کچھ اور؛ نہ تو اقتصادی لحاظ سے

حکومتِ پیغمبرؐ کا اقتصاد، دنیا میں رائج اقتصاد کے مشابہ تھا۔ دنیا کے ہر مقام پر روپے پیسوں، اقتصادیات، مال و دولت کی ریل پیل، ذرائع معاش اور نہ جانے زمین اور سرمایہ کاری کے بارے میں کون کونسے نظریات موجود تھے اور وہ کسی اور ہی طرح عمل کرتے تھے؛ جبکہ پیغمبر اکرمﷺ اِس طرح عمل کرتے تھے کہ دنیا کے اقتصاد کا کوئی نمونہ آپؐ کے اقتصاد کی کیفیت سے میل نہیں کھاتا تھا اور نہ ہی پیغمبرﷺ کے معاشرے میں لوگوں کے ایک دوسرے کے ساتھ روابط اور اجتماعی تعلقات، دنیا کے کسی دوسرے معاشرے کے ساتھ کوئی شباہت رکھتے تھے۔ یہ ایک آئیڈیل چیز تھی، ایک ایسی بے نظیر اور بے‌مثال چیز تھی کہ جس کا کوئی بھی پہلو، دنیا بھر میں موجود نہ تھا۔ پیغمبر اکرمﷺ تشریف لائے اور آپؐ نے کچھ اس قسم کی دنیا کی بنیاد رکھی۔

پیغمبر اکرمﷺ نے مبعوث ہو کر خود (اپنے دستِ مبارک سے) اس (اسلامی) معاشرے کے تمام خدّ و خال اور پہلوؤں کی نقشہ کشی کی، جو لوگوں سے فرمایا خود بھی اُس پر عمل کیا۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو پیغمبر اسلامﷺ نے لوگوں سے کہی ہو اور خود اُس پر عمل نہ کیا ہو۔ لوگوں سے کہتے تھے: نماز پڑھو، خود پہلے ہی سے نماز پڑھنے والے تھے۔ لوگوں سے کہتے تھے: زکات ادا کرو، خود آنحضرتؐ لوگوں سے زکات وصول کرتے تھے۔ لوگوں سے کہتے تھے: راہِ خدا میں (اپنا مال) خرچ کرو، خود اپنا اور لوگوں کا راہِ خدا میں دیا ہوا مال، اس کے (مخصوص) مصارف میں خرچ کرتے تھے۔ لوگوں سے کہتے تھے: (راہِ خدا میں) جہاد کرو، درحقیقت جہاد کا مجسّم نمونہ اور معلّمِ جہاد خود آپؐ کی ذات گرامی تھی؛ یعنی تمام وہ چیزیں جو اسلام میں، اسلامی نظام کے مجموعے کے عنوان سے، پیغمبرﷺ کے ذریعے بیان ہوئیں

تھیں، وہ سب کی سب خود آنحضرتؐ کے عمل میں اور اس معاشرے میں جسے آپؐ نے تشکیل دیا تھا، موجود تھیں۔ پیغمبر اکرمﷺ عملی اور آشکارا طور پر یہ چیزیں لوگوں پر ظاہر کرتے تھے۔

اِس اسلامی نظام کے احکامات میں سے صرف ایک حکم ایسا تھا جسے پیغمبر اکرمﷺ نے بیان تو کیا تھا، لیکن خود اس پر عمل نہیں کیا تھا؛ کہتے تھے لیکن عمل نہیں کر سکتے تھے۔ یہ نظامِ اسلامی کے ارکان میں سے ایک رکن تھا۔ وہ معاشرہ جو پیغمبر اکرمﷺ نے تأسیس کیا تھا، اگر وہ معاشرہ فرض کریں دس یا بارہ ارکان پر مشتمل تھا تو اس کے ارکان میں سے ایک رکن یہ تھا جسے پیغمبرﷺ بیان کرتے تھے، اس کے احکام بیان کرتے تھے، اس کی خصوصیات بیان کرتے تھے، اس کے تمام پہلوؤں اور جوانب کو واضح کرتے تھے؛ لیکن خود رسول اکرمﷺ نے اسلامی نظام کے اِس عظیم رکن پر عمل نہیں کیا تھا اور اس پر عمل کر بھی نہیں سکتے تھے؛ اس لیے کہ پیغمبرﷺ کے اِس رکن پر عمل کرنے کے امکانات موجود نہیں تھے! وہ رکن کیا تھا؟ وہ رکن یہ تھا کہ جس وقت اسلامی معاشرے اور اسلامی نظام کا منظّم تسلسل اور بہاؤ، اپنی راہ سے منحرف ہو جائے اور اس نظام کا کلی تسلسل تبدیل ہونے لگے، تو وظیفہ کیا ہے؟

انحراف و بیگاڑ کی صورت میں وظیفہ کیا ہے؟

جی ہاں! حقیقت یہی ہے کہ یہ چیز ایک نظام کے ارکان میں سے ہے؛ ایک نظام وجود میں آتا ہے اور مشخّص و معیّن کرتا ہے کہ یہ معاشرہ مادی، معنوی اور اقتصادی خصوصیات، حکومت اور دوسری (ضروری) چیزوں کے

ساتھ لازمی طور پر وجود میں آنا چاہیے اور پھر ایسے معاشرے کو وجود میں لے بھی آتا ہے؛ لیکن اگر چنانچہ یہ معاشرہ اپنی راہ اور راستے سے (منحرف ہو کر) باہر نکل گیا، کچھ زورآور، قدرتمند، ظالم و ستمگر اور حملہ آور آئے اور اس معاشرے کو اس کی اصلی بنیادوں اور تعلیمات سے دُور کر دیا یا اس کی شکل و صورت بھی تبدیل کر دی یا صورت تو تبدیل نہ کی لیکن بےروح اور معنویت سے عاری کر دیا، تو وظیفہ کیا ہے؟ اس وقت کیا کرنا چاہیے؟ یہ بھی احکام میں سے ایک حکم ہے۔ اگر دینِ مبینِ اسلام کے بانی اور مؤسّس تمام اسلامی احکام کو تو بیان کریں، لیکن اس ایک حکم کو بیان نہ کریں تو (نعوذ باللہ) انہوں نے ایک ناقص (اور بے نتیجہ) کام کیا ہے؛ اس لیے پیغمبر اکرمﷺ نے اس حکم کو بھی بیان فرمایا تھا۔ آپؐ نے مسلمانوں سے فرمایا تھا کہ اگر کسی وقت اسلامی نظام اپنے اسلامی خطوط و حدود سے خارج ہو اور یہ سمت جس پر اسلامی معاشرہ گامزن ہے، اگر یہ سمت قدرتمندوں، زور زبردستی کرنے والوں، منافقوں اور اپنے آپ کو مسلمانوں کی صف میں ظاہر کرنے والوں کے ذریعے سے تبدیل ہو جائے؛ اگر چنانچہ اس طرح کا کوئی انحراف اور بیگاڑ وجود میں آ جائے، تو اس انحراف کے مقابلے میں کونسا عمل انجام دینا چاہیے؟ اِسے پیغمبر اکرمﷺ نے بیان فرما دیا تھا، لیکن خود آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی نے اس حکم پر عمل نہیں کیا تھا، کیوں؟ کیونکہ آپؐ کے اِس پر عمل کرنے کے امکانات نہیں تھے؛ اس لیے کہ پیغمبرﷺ کے زمانے میں اِس قسم کا انحراف اور بیگاڑ رونما ہی نہیں ہوا تھا، جب تک آپؐ بہ قید حیات تھے ایسا انحراف پیش ہی نہیں آیا تھا کہ خود پیغمبرﷺ اِس حکم پر عمل کرتے کہ انحراف کے مقابلے میں کس طرح عمل کرنا چاہیے۔

ضروری ہے کہ اِس حکم کا تعلق پیغمبر اکرم ﷺ کے جانشینوں کے زمانے سے ہو، یعنی اگر رسول اکرم ﷺ کے جانشینوں کو ایسی صورتِ حال کا سامنا ہو کہ ان کے زمانے میں اسلامی معاشرہ اِس قدر انحراف و بیگاڑ کا شکار ہو جائے اور یہ خطرہ لاحق ہو جائے کہ اسلامی مفاہیم اور تعلیمات کلی طور پر تبدیل ہو جائیں گی، تو اِس قسم کی صورتِ حال میں اور اس وقت کونسا عمل انجام دینا چاہیے؟ اس وظیفے کو ضروری ہے کہ آنحضرتؐ کے جانشینوں میں سے کوئی ایک انجام دے۔ وہ کونسا جانشین ہو؟ اس میں فرق نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق اِس بات سے ہے کہ وہ خاص شرائط اور حالات پیغمبر ﷺ کے بعد ائمہ معصومین علیہم السلام میں سے کس کے زمانے میں پیش آتے ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد بڑی حد تک یہ خصوصیات محفوظ رہیں، اگرچہ ٹکراؤ اور تصادم کی کیفیت پیش آئی اور شرافت مندانہ انسانی اور الٰہی حاکمیت جیسے عظیم پیکر پر چوٹ بھی لگی اور مسلمان (پے در پے) فتوحات اور بعض دوسرے (سیاسی) مسائل کی وجہ سے، مال و دولت، دنیا طلبی اور عیش و عشرت جیسی چیزوں میں کم و بیش سرگرم ہو گئے، لیکن جیسے ہی حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام (ظاہری طور پر) خلافت کے منصب پر فائز ہوئے، پھر وہی الٰہی حاکمیت تجدید ہو گئی، اب جبکہ علی ابن ابیطالب علیہما السلام حاکمِ اسلامی بن گئے، تو بجائے اِس کے کہ لوگوں پر فخر و مباہات، تکبُّر و خود خواہی اور ناز و نعم کی راہ اختیار کرتے، بلکہ ایک عام آدمی، حتی کہ معیار زندگی کے لحاظ سے، سب لوگوں سے نچلی سطح کی زندگی، (مسلمانوں کے) امیر المومنینؑ ہونے کے باوجود اختیار کرتے ہیں؛ یعنی ایک ایسی حالت کہ جس کا ہمیں پیغمبر اکرم ﷺ کی زندگی میں بھی مسلسل اور دُشوارترین و سخت خصوصیات کے باوجود کوئی سراغ نہیں ملتا۔ آپؑ نے اس طرح کی کیفیت

اس لیے اختیار کی، تاکہ لوگوں کو اُس اشرافیت کی دلدل اور طاغوتی زندگی میں غرق ہونے سے نجات دیں، جس کی طرف مسلمان تدریجاً بڑھ رہے تھے اور وہی زمانۂ جاہلیت کی مشکلات اور مصیبتیں دوبارہ لوگوں کی طرف لوٹ رہیں تھیں اور اُن پر مسلّط ہو رہیں تھیں۔

لیکن امیر المومنین علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد، دوبارہ وہ سارا اجتماعی اور معاشرتی انحراف و بیگاڑ اسی سمت جانے لگا، جس سے انبیائے الٰہی علیہم السلام اور ان کے اوصیاء نے لوگوں کو روکنا چاہا تھا؛ یعنی پھر وہی زور و زبردستی کی حکومت، اشرافیت و دکھاوے کی حکومت، ہوا و ہوس اور خوش گذرانی کی حکومت، خواصّ اور اُمراء و حکمرانوں کے قرابتداروں کی حکومت، جاہلی اقدار کی بنیاد پر حکومت، نہ کہ اسلامی اقدار کی بنیاد پر؛ دوبارہ یہ سب چیزیں لوٹ آئیں؛ یعنی وہی صورتِ حال جس کی حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اپنی (ظاہری) حکومت اور خلافت کے آغاز میں لوگوں کے لیے تشریح و وضاحت کر دی تھی: «أَلَا وَاِنَّ بَلِیَّتَکُم قَد عَادَتْ کَهَیئَتِها یَومَ بَعَثَ اللهُ نَبِیَّهُ صَلَّی اللهُ عَلَیهِ وَآلِهِ وَسَلَّم»[1] اور یہ صورتِ حال جو اس وقت استبداد (اور ظلم و جور) کی صورت میں وجود میں آگئی تھی، گذشتہ خلفاء کے زمانے میں موجود نہیں تھی۔ اُس وقت لوگ اعتراض کا حق رکھتے تھے، اعتراض کرتے تھے، خلیفہ کے خطاب کے دوران کھڑے ہو جاتے تھے۔ اگر بعض افراد کی نسبت سخت گیری اور شدّتِ عمل دکھائی دیتا تھا کہ جو دوبارہ جاہلیت کی سمت لوٹ جانے (اور جاہلی طور طریقے اپنانے پر) اعتراض کرتے تھے، تو وہ سخت گیری اس

۱۔ نہج البلاغہ، صبحی صالح، خطبہ۱۶؛ امیر المومنین علی علیہ السلام نے مدینہ والوں کے اپنی بیعت کرنے کے وقت فرمایا: ''ہوشیار رہو کہ امتحان کی وہی گھڑی جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت موجود تھی، دوبارہ لوٹ آئی ہے۔''

حدّ تک تھی کہ مثلاً جناب ابوذر غفاری کو ''ربذہ'' کے مقام پر جلاء وطن کر دیں یا کبھی عمار یاسر کی خلیفۂ وقت کے سامنے پٹائی کر دیں؛ اس سے بڑھ کر نہیں تھا۔ حقیقی مومنین اور اصحابِ پیغمبرؐ کے لیے، جن کی تعداد کم نہ تھی، سانس لینے اور اعتراض کرنے کی گنجائش موجود تھی، وہ جو چاہیں کہہ سکتے تھے اور اگر کوئی جنبش یا سیاست، جاہلی اقدار اور زمانۂ طاغوت کی کیفیت کی سمت لے جانے والی وجود رکھتی تھی تو لوگوں کو روک لیا جاتا تھا؛ لیکن امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد اِس قدر گھٹن اور جبر و استبداد کا ماحول ہر جگہ پر حاکم ہوا کہ ہر شخص سے حتی کہ سانس لینے کی طاقت بھی چھین لی گئی۔

تاریخ نویس اور مؤرّخین شہادتِ امیر المومنینؑ کے بعد اُس زمانے کے اوضاع و حالات کی جو تصویر کشی بیان کرتے ہیں، وہ اِس قدر اس زمانے کے لوگوں، بالخصوص مسلمانوں، مومنین اور حقیقی وفاداروں اور مخلصین کے لیے ایک تلخ مصیبت نامے سے حکایت ہے کہ انسان تعجب کرنے لگتا ہے کہ ابھی پیغمبر اسلامﷺ کی رحلت کو نصف صدی بھی نہ گزری تھی اور اسلام ابھی تر و تازہ اور نوخیز تھا اور لوگ بھی نومسلم اور تازہ مسلمان تھے اور دوسرے شہر و مناطق بھی آہستہ آہستہ اسلام کی طرف مائل ہو رہے تھے، (اس نازک موقع پر) اسلامی اصول و قوانین ایسے تبدیل ہو جائیں کہ ہر چیز ہی بدل کر رہ جائے؛ کچھ اِس طرح کی صورتِ حال اس وقت پیش آ چکی تھی۔

انحراف و بیگاڑ کا پیغمبر اکرمﷺ کی حدیث میں بیان

جناب ابوذر غفاری سے منقول ایک قول میں پیغمبر اکرمﷺ فرماتے ہیں: «اِذَا بَلَغَ آلُ اَبِی العَاصِ ثَلاثِینَ»[1] ابو العاص کا خاندان، جو بنی اُمیہ کی اہم شاخوں میں سے ایک تھا اور اسی ابو العاص کی نسل نے تقریباً پچاس (۵۰) سال تک عالمِ اسلام پر حکومت کی ہے، مروان ابن حکم سے مروانِ حمار تک، جو بنی اُمیہ کے آخری اور مروانی سلسلے کے سارے کے سارے خلفاء تھے، (پیغمبرﷺ فرماتے ہیں:) جب اس ابو العاص کے خاندان کے افراد کی تعداد تیس (۳۰) نفر تک پہنچ جائے گی، تو جناب ابوذر پیغمبر اکرمﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: «اِتَّخَذُوا مالَ اللهِ دُوَلاً وَعِبادَ اللهِ خَوَلاً وَدینَ اللهِ دَخَلاً» تمام وہ جدّ و جہد اور مبارزہ جس کے لیے امام حسین ابن علی علیہما السلام نے اپنی تحریک کا آغاز کیا اور قیام فرمایا اور قیامِ امام حسینؑ سے پہلے دنیائے اسلام، جس بڑی مصیبت اور آفت میں مبتلا ہو چکی تھی، ایسی مصیبت جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ گراں خاطر تھی، وہ ان تین جملوں میں خلاصہ کی جا سکتی ہے؛ یعنی طاغوتی حکومت اور الٰہی حکومت کے درمیان جو فرق ہے، وہ انہیں تین نقطوں میں ہے۔

پہلا نقطہ اموال کے بارے میں؛ ظالم اور طاغوتی حکومت ایسی ہوتی ہے جو خدا کے مال کو اپنا مال سمجھتی ہے، زمین میں موجود خزانے، بیت المال، عمومی ثروت، درآمد، محصولات اور وہ سب چیزیں جنہیں تمام لوگوں کے درمیان تقسیم ہونا چاہیے، وہ امکانات و وسائل جن سے سب لوگوں کو بہرہ مند اور مستفید ہونا چاہیے، نہ صرف یہ کہ ان سب چیزوں کو لوگوں کا

۱۔ بحار الانوار، کتاب الفتن و المحن، باب۳۱، حدیث۶۔

مال نہیں سمجھتی، نہ صرف یہ کہ محروم اور ضرورتمندوں کو اس میں زیادہ حقدار اور زیادہ حصّہ دار نہیں سمجھتی اور نہ صرف یہ کہ دولت مندوں، اشراف اور قدرت مندوں کے (متجاوز) ہاتھوں کو ان اموال سے منقطع نہیں کرتی، بلکہ اس کے برعکس، محرومین، فقراء و مساکین اور مستضعفین کے ہاتھوں کو اِن خدا کے اموال سے منقطع کرتی اور کاٹتی ہے اور مالِ خدا کو انحصاری اور اختصاصی طور پر اپنے لیے مخصوص قرار دیتی ہے اور خود وہ اور اس کے ٹکڑوں پر پلنے والے (بھوکے) کتّے ہی مالِ خدا سے استفادہ کرتے ہیں: «اِتَّخَذُوا مَالَ اللّٰهِ دُوَلاً» یہ طاغوتی حاکمیت کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے، جو حاکمیتِ الٰہی کے بالکل مدِّمقابل نقطہ ہے، حاکمیتِ الٰہی مالِ خدا کو خدا کا مال اور خدا کے بندوں سے متعلق سمجھتی ہے اور اسے خدا کے کمزور، ناتوان اور ضعیف ترین بندوں کو دیتی ہے اور فقیروں، مسکینوں اور محروموں کو ثروت مندوں، مالداروں، اشرف اور قدرتمندوں پر ترجیح دیتی ہے اور خود اپنے آپ کو معاشرے کے پست ترین اور محروم ترین انسانوں کی صف میں قرار دیتی ہے؛ جیسے حضرت امیر المومنین علی علیہ الصلاۃ و السّلام کی حکومت، آپ حضرات جانتے ہیں کہ امیر المومنین علیہ السلام ایسی غذا کھاتے اور ایسا لباس زیب تن کرتے تھے کہ دنیائے اسلام میں اُس وقت، اس سے زیادہ سخت تر غذا اور لباس موجود ہی نہیں تھا۔ جی ہاں! یہ ایک فرق تھا جو آل ابی العاص - یعنی بنی اُمیہ کی وہ شاخ جس نے سالوں حکومت کی اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کی حکومت اور اقتدار سے ڈرایا بھی کرتے تھے - کے طرزِ حکومت اور حضرت امام حسین علیہ السلام اور حضرت علی ابن ابیطالب علیہما السلام کی دلخواہ اور موردِ پسند حکومت کے درمیان موجود تھا۔

دوسرا نقطہ: «وَعِبادَ اللّٰهِ خَوَلاً» یہ طاغوتی حکومتوں کی دوسری خصوصیت ہے کہ وہ بندگانِ خدا کو «خَوَل» یعنی اپنا غلام اور بندہ شمار کرتے ہیں۔ البتہ ممکن ہے کہ زبان سے اِس بات کا اظہار نہ کریں کہ لوگ ہمارے غلام ہیں؛ لیکن درحقیقت واقعیت یہی ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں اور یہ وہی چیز تھی جس نے بنی اُمیہ اور بنی عباس کی حکومتوں میں اسلام کی ابتدائی صدیوں میں شدّت کے ساتھ پیشرفت کی اور تیزی سے پروان چڑھتی رہی؛ یہ سلسلہ معاویہ کے زمانے سے شروع ہوا اور یزید کے زمانے میں بھی موجود تھا اور اس کے بعد مروان اور عبد الملک کے زمانے میں اپنی انتہاء کو پہنچ گیا اور اسی طرح جاری و ساری رہا؛ یعنی عوام الناس کو واقعاً اپنا غلام سمجھتے تھے۔ البتہ ابتدائی دہائیوں میں یہ بات کہتے نہیں تھے، بعد میں جب چند دہائیاں (ان کی حکومت اور اقتدار کی) گزر گئیں، تو تیسری صدی ہجری کے شروع میں یا دوسری صدی ہجری کے اواخر میں، عرب کا ایک مشہور و معروف مصنّف یعنی ''جاحظ'' صراحت کے ساتھ اپنی کتابوں میں (یہ بات) لکھتا ہے کہ تمام لوگ امیر المومنین کے غلام ہیں؛ یعنی اسی فاسق و فاجر خلیفہ کے غلام، جسے وہ امیر المومنین کا نام دیتے تھے۔ وہ لکھتا ہے: وہ (خلیفہ) آقا و مولا ہے اور ''وَالنَّاسُ عَبِيْدٌ لَهُ'' لوگ اس کے بندے اور غلام ہیں۔ جی ہاں! یہ تفکر اور یہ سوچ، اسلام کے ابتدائی انحراف اور اسلامی حکومت کا راستہ ٹیڑھا ہونے کے بعد پیدا ہوئی۔ یہ ایک دوسری خصوصیت ہے کہ «وَعِبادَ اللّٰهِ خَوَلاً» عوام الناس کو، بندگانِ خدا کو اپنا بندہ اور غلام شمار کرتے ہیں، لوگوں کی نسبت کسی قسم کی عزّت و احترام کے قائل نہیں ہیں، ان کے کسی حق کو نہیں مانتے؛ نہ کوئی حق انتخاب ہے اور نہ ہی حق رائے۔ اگر کسی کی بیعت بھی کرنی ہے تو اس کی جس کی خلیفہ یا طاقتور، زورآور، شمشیر

بہ دست اور قدرتمند طبقہ پسند کرے، لوگوں کو چاہیے کہ اسی کی مجبوراً بیعت کریں، لوگوں کو کچھ اِس طرح کی صورتِ حال سے واسطہ تھا۔

تیسرا نقطہ: «وَدِینَ اللّٰہِ دَخَلاً» دینِ خدا وند متعال کو اپنے ہاتھوں کا بازیچہ اور کھیل تماشا قرار دیتے ہیں۔ لفظِ «دَخَلاً» کا معنی یہ ہے کہ وہ دینِ خدا کے ساتھ اپنے مَن پسند کام انجام دیتے ہیں۔ ایک وقت ضروری ہے کہ اظہارِ تعبُّد و بندگی کریں، تاکہ لوگوں کو (فریب اور جھانسا دے کر اپنی طرف) مجذوب کریں، اپنا معتقد و مرید بنائیں تو اسلام و قرآن کا نام اپنی زبان پر لاتے ہیں، نماز جماعت پڑھتے ہیں (ہر طرح کی ریا کاری اور دکھاوا کرتے ہیں)۔ ایک اور وقت ضروری ہے کہ احکامِ اسلام کو اپنی ذاتی و شخصی زندگی یا اپنی اجتماعی زندگی میں یا کسی کام میں یا کسی حکم میں یا کسی جنگ یا صلح کے موقعہ پر آسانی کے ساتھ کچل دیں اور پامال کر دیں اور جس طرح بھی چاہتے ہیں اسلام سے استفادہ کریں، تو ایسا ہی کرتے ہیں۔ گویاکہ اسلام، ان کی ہدایت و راہنمائی کرنے والا اور انہیں دستور دینے والا نہ ہو، بلکہ یہ وہ ہوں کہ جس وقت اور جس طرح سے ان کا دل چاہے اسلام کے نام سے استفادہ کریں۔ وہی چیز جو بنی اُمیہ اور بنی عباس کے خلفاء کی زندگی میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اگر کوئی شخص پہلی اور دوسری صدی ہجری کے ان گریہ آور تاریک و سیاہ ایام کی تفصیل کتابوں میں پڑھے، تو وہ اس وقت سمجھے گا کہ «وَدِینَ اللّٰہِ دَخَلاً» جس کی خبر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آل ابی العاص کے بارے میں دی تھی، اس کا مطلب کیا ہے۔ ہر وہ کام جس کو ان کا دل چاہتا تھا، انجام دیتے تھے۔ حدیثیں گھڑتے تھے، بعض آیات کے پڑھنے سے روکتے اور ان کی تفسیر کرنے کو حرام قرار دیتے تھے۔ (مثلاً کہتے تھے:) فلاں آیت کو پڑھو اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس طرح معنی کرو (یعنی) بالکل اسی

طرح جس کی انہیں ضرورت اور نیاز ہوتی تھی۔ کچھ ایسے (نام نہاد) لوگ بھی تھے جنہیں ''رجال دین'' (یعنی دینی علماء و شخصیات) کہا جاتا تھا، جو سینہ پر تعظیماً ہاتھ رکھنے والے، مزدور، خلافت کے پُر چرب، مرغّن اور انواع و اقسام سے پُر دسترخوان پر بیٹھنے اور اس سے بہرہ مند ہونے والے، دین خدا کو بھول جانے والے تھے، جو اِن سے چاہتے، یہ اُن کی خواہش اور میل کے مطابق انجام دیتے تھے۔

یہ تین نقطے وہ ہیں جن کی پیغمبر اکرمﷺ نے (پہلے ہی سے) خبر دی تھی، جناب ابوذر غفاری کی روایت کے مطابق، آپ نے فرمایا کہ جب آل ابی العاص کی تعداد تیس (۳۰) افراد تک پہنچ جائے گی، تو وہ یہ کام انجام دیں گے: «اِتَّخَذُوا مَالَ اللهِ دُوَلاً» مالِ خدا کو اپنا مال سمجھیں گے، «وَعِبادَ اللهِ خَوَلاً» بندگانِ خدا کو اپنے بندے اور غلام سمجھیں گے، «وَدِینَ اللهِ دَخَلاً» دینِ خدا کو (اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے) بازیچہ بنا دیں گے؛ اور یہی سب کچھ ہو چکا تھا۔ آل ابی العاص حکومتی مشینری میں شاید ابھی تیس (۳۰) افراد تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ عالمِ اسلام کے لیے یہ سب مشکلات پیدا ہو گئیں تھیں؛ یعنی حکومتِ الٰہی اور امامت، وہ الٰہی منصب جس کے بارے میں قرآنِ کریم فرماتا ہے: «یَهْدُونَ بِاَمْرِنَا»[1] ''ہمارے حکم سے لوگوں کی ہدایت کرتے ہیں۔'' نماز قائم کرتے اور زکات ادا کرتے ہیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں؛ ایک اس طرح کا منصبِ امامت اور ایک اس طرح کا مفہوم، اب طاغوتی سلطنت میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا؛ ایک ایسی حکومت کہ جس قدر کسی شریر ترین اور شیطان صفت ترین بدبختی کا کسی انسان کی ذات سے تصوّر کیا جا سکتا ہے، انسان اِن سلاطین

۱۔ سورۂ مبارکہ انبیاء، آیت ۷۳۔

کی زندگی (اور ان کی حکومت) میں مشاہدہ کر سکتا ہے۔ ہر وہ بُرائی جو وہ جانتے تھے، انجام دیتے تھے اور جن بُری چیزوں اور قباحتوں کا انہیں علم نہ تھا، وہ اپنے سابقہ حکمرانوں، ایران کے بادشاہوں اور روم کے فرمانرواؤں کی یادگاروں سے سیکھتے اور انجام دیتے تھے؛ ایک اس قسم کی ناگفتہ بہ صورتِ حال وجود میں آچکی تھی۔

اِس انحراف و بیگاڑ کے مدِّمقابل کون قیام کرے؟

اب اِس قسم کی صورتِ حال اور وضعیت کے مقابلے میں کیا کرنا چاہیے تھا؟ یہ تاریخ کے سامنے ایک بہت بڑا سوال ہے! یہ اُس وقت کے عالمِ اسلام اور بعد میں آنے والی تمام اسلامی نسلوں کے لیے ایک ناشناختہ اور نامعلوم حکمِ الٰہی ہے کہ جب اسلامی معاشرے کے لیے اِس قسم کی صورتِ حال پیش آئے تو کیا کرنا چاہیے؟ اور وظیفہ و ذمہ داری کیا ہے؟ جس وقت حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام مسندِ حکومت و قدرت پر فائز تھے؛ تو ان کا وظیفہ اور ذمہ داری یہ تھی کہ اجازت نہ دیں کہ اس قسم کی صورتِ حال وجود میں آئے؛ اس لیے آپؑ جنگ کرتے تھے، جب تک علی علیہ السلام بہ قید حیات رہے کوئی شخص اعلانیہ طور پر فسق و فجور اور گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا تھا۔ آپؑ قرآنِ کریم کی آیات سے تمسک (اور استدلال) کرتے تھے۔ امیر المومنین علیہ السلام کی شہادت کے بعد، حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے بھی اسی راستے کو اپنایا اور اسی کی پیروی کی، یہاں تک کہ آپؑ نے احساس کیا کہ آپؑ علی ابن ابیطالب علیہما السلام کی مانند آگے نہیں بڑھ سکتے؛ امیر المومنین علیہ السلام کے پاس افرادی قوت کافی زیادہ تھی، وہ جنگ و جہاد کے لیے بھی تیار تھے، لیکن وہ افرادی قوت

و طاقت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے اختیار میں نہ آسکی، پانچ سال گزرنے کے بعد وہ افراد جنگ کے لیے بھی تیار نہ تھے۔ وہ خصوصیات جو حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے اندر موجود تھیں اور اسی وجہ سے وہ افرادی قوت کو اکٹھا کر سکتے تھے، معاویہ کے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے دور میں زیادہ سے زیادہ اثر و نفوذ حاصل کر لینے کی وجہ سے، وہ پہلے والی خصوصیات بھی اب وجود نہیں رکھتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام مجبور ہوئے کہ اپنا راستہ اور طریقۂ کار تبدیل کریں؛ یعنی راستہ اور ہدف ایک ہی ہے، لیکن ٹیکنک اور طریقۂ کار ایک دوسری چیز ہے، جس کے بارے میں، میں نے امام حسن علیہ السلام کی زندگی اور آپؑ کی صلح کے ضمن میں شاید پہلے بحث کی ہے؛ اگر کسی وقت فرصت میسر آئی اور اس بارے میں بحث و گفتگو کر سکا تو واضح اور روشن کروں گا کہ وہ بہترین، خوبصورت ترین اور مضبوط و قوی ترین کام جو امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانے میں انجام دیا، اس وقت جب لوگ ابھی آگاہ اور مطلع نہ تھے، ابھی طاغوتی حکومت کی حقیقت ان کے لیے آشکارا اور عیاں نہیں ہوئی تھی، ابھی وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کون کونسی مصیبتیں اُن کے انتظار میں ہیں؛ کچھ اس قسم کی شرائط اور صورتِ حال میں بہترین اور قوی ترین کام وہی تھا جو امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے انجام دیا؛ یعنی معاویہ کے ساتھ صلح، اس صلح کا مطلب جنگ بندی تھا لیکن یہ صلح بھی ایک قسم کی ٹیکنک اور حکمتِ عملی تھی اور اس وقت کے خواصّ یہ بات جانتے تھے کہ امام حسن علیہ السلام کسی مناسب فرصت کے انتظار میں ہیں تاکہ اچھی طرح ماحول کو سازگار بنا سکیں۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے دس سال تک سعی و کوشش کی، انتھک محنت کی اور کافی حد تک ماحول کو سازگار بنا لیا، یہاں تک کہ امام حسن علیہ السلام کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔

اس کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام کی نوبت آئی تو امام حسین علیہ السلام نے بھی اسی امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے راستے کو جاری رکھا، پورے دس سال امام حسین علیہ السلام بھی اسی انداز سے کام کرتے رہے، لوگوں سے گفتگو میں حالات سے آگاہی کا سامان کیا، ان کی فکری تربیت کی، اپنے قریبی اصحاب اور ساتھیوں کو سفارشات اور نصیحتیں کرتے رہے، شیعوں کو آپس میں متحد رہنے کی تلقین کرتے رہے، علماء، فقہاء اور دوسرے مؤثر افراد کو ان کے وظائف اور ذمہ داریوں کا احساس دلاتے رہے؛ لیکن معاویہ کے (بر سرِاقتدار) ہوتے ہوئے کوئی دوسرا کام انجام نہیں دیا جا سکتا تھا، کیونکہ معاویہ نے سختی کے ساتھ ہر چیز پر اپنا کنٹرول جمایا ہوا تھا، اس کے زندہ ہوتے ہوئے ایسا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ جس کی اُمید اس وقت کے حالات میں کی جا سکے؛ لیکن سن ۶۰ ہجری میں معاویہ دنیا سے چل بسا، جس وقت معاویہ دنیا سے چلا گیا، تو (قیام کے لیے) وہ ضروری ماحول فراہم ہو گیا؛ یعنی لوگ پہلے سے تیار ہیں، اذہان بھی کافی حدّ تک آمادہ ہیں، کیونکہ تمام چیزیں لوگوں کو بتا دی گئی ہیں۔

دوسری طرف یزید کی شخصیت، معاویہ کی شخصیت سے کسی بھی طرح قابلِ مقائسہ و موازنہ نہیں ہے۔ معاویہ نے کم از کم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کو درک کیا تھا، لوگ اس سے اسلام کے ظواہر کا مشاہدہ کرتے تھے۔ اُس کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رشتہ داری کچھ لوگوں کو اس کی طرف مائل کرتی تھی، اس کے علاوہ ضدِّ اسلام اور خلافِ شرع کاموں کا علی الاعلان مرتکب نہیں ہوتا تھا۔ ایک جانی پہچانی شخصیت کا حامل تھا۔ خود معاویہ اور اس کا بھائی شام کو فتح کرنے گئے اور فتح کرنے کے بعد وہیں ٹھہر گئے اور شام اُن کی حکومت کا مرکز بن گیا تھا۔ لیکن یزید اِن خصوصیات کا مالک نہیں تھا، یزید کا عالمِ اسلام سے بنیادی طور پر کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ یزید ایک

شراب خوار، فاسق و فاجر اور اعلانیہ طور پر گناہ کا ارتکاب کرنے والا آدمی اور ایک ایسا شخص تھا کہ دنیائے اسلام میں سے حسین ابن علی علیہما السلام جیسا کوئی شخص اُس کے خلاف پرچمِ مخالفت بلند کر سکتا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ میں یزید جیسے شخص کی بیعت کرنے کے لیے حاضر نہیں ہوں؛ اس لیے کہ وہ بیعت کے لیے شائستہ اور سزاوار فرد نہیں ہے اور یہ (آپؑ کا انکار) ایک ایسی تحریک کا مبداء و آغاز بن جائے جس کی بنیاد پر آپؑ سفر کا آغاز کریں اور اپنے ساتھ لوگوں (کی ایک مخصوص تعداد) کو بھی لے چلیں اور عالمِ اسلام کو زندہ کریں اور اسلامی نظام کو دوبارہ (اُس کے صحیح مقام پر) پلٹائیں اور ملوکیت و سلطنت کو دوبارہ الٰہی و اسلامی امامت میں تبدیل کر دیں؛ کچھ اِس قسم کا ماحول سازگار ہو گیا تھا۔ یہاں حسین ابن علی علیہما السلام کا کردار واضح اور روشن ہوتا ہے۔ البتہ میں آپ سے یہ بھی عرض کر دوں کہ اگر تاریخ کے اِس مرحلے میں، ہمارے ائمہ اطہار علیہم السلام میں سے جو کوئی بھی امام حسین علیہ السلام کی جگہ پر ہوتا، تو وہ بھی یہی کام انجام دیتا۔ اگر یہی صورتِ حال امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی زندگی کے دور میں پیش آئی ہوتی، امام زین العابدین علیہ السلام کے زمانے میں پیش آتی، امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں پیش آتی اور یا امام علی نقی اور امام حسن عسکری علیہما السلام کے زمانے میں پیش آتی؛ ائمہ معصومین علیہم السلام میں سے جس کے زمانے میں بھی یہ صورتِ حال اور اِس قسم کی شرائط پیش آتیں، تو اسلام کے شہید بزرگ اور سید الشہداء بھی وہی امامِ بزرگوار قرار پاتے۔ لیکن یہ شرائط امام حسین علیہ السلام کے دور میں پیش آئیں اور اِس چیز کی خبر خدا وند متعال نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلے ہی سے دے دی تھی اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی (لوگوں کو) اِس سے آگاہ فرما دیا تھا۔

پس وہ وظیفہ کونسا تھا؟ جس کے بارے میں پیغمبر اکرمﷺ نے دستور دیا ہوا تھا اور علمِ الٰہی میں بھی معلوم و محفوظ تھا اور اسلامی نظام کے ارکان میں سے شمار ہوتا تھا کہ جب اسلامی نظام اپنے حقیقی اور صحیح راستے سے ہٹنے لگے تو ضروری ہے کہ یہ کام انجام دیا جائے اور اس وظیفے پر عمل کیا جائے، وہ وظیفہ کیا تھا؟ وہ وظیفہ جسے پیغمبرﷺ نے معیّن فرما دیا تھا اور حضرت امام حسینؑ نے اُس پر عمل کیا تھا، وہ وظیفہ کیا تھا؟

وظیفے کی انجام دہی میں علماء و مؤرّخین کے نظریات

اس وظیفے کے بیان کرنے اور امام حسین ابن علیؑ کے عمل کی جمع بندی کرنے کے حوالے سے، مختلف نظریات اور آراء بیان کی گئی ہیں؛ علماء نے بہت سی باتیں بیان کی ہیں، سابقین اور گذشتگان نے بھی باتیں کی ہیں اور بعد میں آنے والوں نے بھی۔ اِن آخری سالوں میں (اِس حوالے سے) دو طرح کی جمع بندی پائی جاتی ہے، جن میں سے میری نظر میں کوئی سی جمع بندی بھی درست نہیں ہے، بلکہ مسئلہ کچھ اور ہی ہے؛ یعنی ایک تیسری چیز امام حسین ابن علیؑ کے اِس عمل کے سلسلے میں جمع بندی کے طور پر صحیح ہے۔

بعض لوگ اس نظریے کے قائل ہوئے ہیں کہ امام حسین ابن علیؑ نے حکومت حاصل کرنے (اور اقتدار کو ہاتھ میں لینے) کے لیے قیام فرمایا تھا؛ یعنی قیامِ امام حسینؑ صرف حکومت کے حصول کے لیے تھا؛ صرف اس لیے تھا کہ حضرتؑ خود حکومت کی باگ ڈور سنبھال لیں، کیونکہ آپؑ دیکھ رہے تھے کہ یزید ایک غیر صالح اور فاسد و فاسق شخص ہے اور اُس نے

اسلامی معاشرے کو بڑے خطرے سے دوچار کر دیا ہے، یہی وجہ تھی کہ امام حسین علیہ السلام نے قیام فرمایا تاکہ حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ آپؑ نے لشکر اور سامانِ جنگ بھی فراہم کر لیا تھا - جبکہ یہ صرف باتیں ہی ہیں- اس کے بعد جب مکہ معظمہ سے کوفہ کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہاں قیام کریں اور آج کی اصطلاح میں کوفہ کو آزاد کرائیں اور اپنے لشکر اور سپاہ کو وہاں جمع کرکے (یزید کی) مرکزی حکومت کے خلاف شورش برپا کریں، لیکن جب آپؑ نے دیکھا کہ یہ ممکن نہیں ہے اور راستے ہی میں خبر ملی کہ کوفہ والے (اپنی حمایت اور وعدوں سے) پلٹ گئے ہیں تو آپؑ نے بھی وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور فرمایا: ''مجھے چھوڑ دو تاکہ میں یمن چلا جاؤں یا وہیں چلا جاؤں جہاں میں پہلے تھا اور وہیں اپنی زندگی گزاروں۔'' ایک نظریہ تو اِس بارے میں یہ ہے۔ البتہ اس نظریے کے ماننے والے (اپنے اس نظریے کی) تائید میں دلائل اور قرائن بھی ذکر کرتے ہیں؛ لیکن مجموعی طور پر یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔

دوسرے بعض لوگ اس نظریے کی طرف گئے ہیں کہ نہیں جناب، امام حسین ابن علی علیہما السلام ہرگز حکومت کرنے (یا اقتدار حاصل کرنے) کی کوئی نیت یا ارادہ نہیں رکھتے تھے، آپؑ کا مسلمانوں پر حکومت و ریاست کرنے (اور زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینے) کا کوئی ارادہ نہیں تھا، بلکہ آپؑ تو قتل اور شہید ہونا چاہتے تھے، دراصل آپؑ نے اس لیے قیام فرمایا تاکہ شہید کر دیئے جائیں، کیونکہ آپؑ یہ دیکھ رہے تھے کہ زندہ رہنے کے ساتھ اپنے اس الٰہی وظیفے اور ذمہ داری کو انجام نہیں دے سکیں گے، لہٰذا آپؑ نے سوچا کہ اپنے قتل کیے جانے کے ساتھ اس الٰہی وظیفے اور ذمہ داری کو انجام دیں۔ اب جبکہ زندہ رہنے کے ساتھ ہم کوئی کام انجام نہیں دے سکتے، تو پس

شہید ہو جانے کے ساتھ ہی ایسا کام کر جائیں؛ یہ بھی ایک نظریہ اور طرزِ فکر ہے؛ یہ نظریہ اِس بات پر قائم ہے کہ حسین ابن علی علیہما السلام جب ابتداء میں مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تھے، تو اُس وقت سے مسلسل آپؑ کی نیت و ارادہ یہی تھا کہ جائیں اور شہید ہو جائیں۔ حقیقت میں آپؑ کا ارادہ اس کے سوا کچھ اور نہ تھا، جب آپؑ مکہ معظمہ تشریف لائے، تب بھی یہی ارادہ رکھتے تھے، آپؑ منصوبہ بندی کر رہے تھے کہ کونسی حسّاس اور مناسب موقعیت پیش آئے، جب آپؑ شہادت کے رفیع و بلند درجہ پر فائز ہوں؛ یہ بھی ایک نظریہ ہے اور یہ نظریہ بھی (پہلے نظریے کی مانند) صحیح نہیں ہے۔

حقیقتِ امر یہ ہے کہ حضرت حسین ابن علی علیہما السلام نہ تو حکومت حاصل کرنے کے لیے جا رہے تھے اور نہ ہی شہید ہونے کے لیے، وہ چیز جو میں یہاں پر ایک جملے میں (آپ برادران و خواہران کی خدمت میں) بیان کرنا چاہتا ہوں -اس بات کو بطورِ خلاصہ ذہن میں رکھیں، اس کی تفصیل بعد میں بیان کروں گا- وہ یہ ہے کہ شہید ہونا اور حکومت حاصل کرنا، امام حسین ابن علی علیہما السلام کے اہداف و مقاصد میں سے نہیں تھا؛ بلکہ امام حسین علیہ السلام کے قیام اور تحریک کے نتائج میں سے تھا۔ امام حسین علیہ السلام کے قیام اور تحریک کا قطعی اور یقینی نتیجہ، ان دونوں میں سے کوئی ایک ہونا تھا؛ یعنی امام حسین علیہ السلام اس راستے میں یا تو حکومت حاصل کر لیتے اور یا پھر شہید کر دیئے جاتے۔ اس بات کو امامؑ بھی جانتے تھے۔ البتہ ہم جانتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کو بھی معلوم تھا کہ آپؑ شہید کر دیئے جائیں گے؛ لیکن وہ تحریک جس کا آغاز امام عالی مقام علیہ السلام نے فرمایا تھا، اس کا طبیعی طور پر انجام اِن دو نتیجوں میں سے کسی ایک کی صورت میں نکلنا تھا؛ یعنی شہید ہو جانا یا حکومت حاصل کر لینا، کوئی ایک نتیجہ تو ضرور ہونا ہی تھا؛ لیکن ان دونوں میں سے کوئی

بھی امام حسین علیہ السلام کا ہدف و مقصد نہیں تھا۔ امام حسین علیہ السلام کا ہدف و مقصد کیا تھا؟ آپؑ کا ہدف و مقصد خود قیام اور (یزید کی حکومت کے خلاف) ایک مزاحمتی تحریک کا آغاز کرنا تھا؛ خود ایک (الٰہی) تحریک اور جنبش کو ایجاد کرنا اور اپنی مخالفت کا اعلان کرنا تھا۔ اگر یہ مزاحمتی تحریک، حصولِ حکومت و اقتدار تک منتہی ہو جاتی، تو کیا ہی اچھا تھا، کیونکہ امام حسین علیہ السلام نے قیام کیا تھا اور اس کے نتیجے میں حکومت حاصل کر لی تھی، لہٰذا آپؑ حکومت کی باگ ڈور سنبھال لیتے اور دنیا کو آباد کرتے اور دنیا کو (امن و آشتی کا گہوارہ اور) گلستان بنا دیتے اور حکومتِ نبویؐ کے سلسلے کو جاری رکھتے؛ لیکن اگر چنانچہ اِس قیام کے نتیجے میں حکومت نہ ملتی اور آپؑ بالآخر اِس قیام کے نتیجے میں قتل اور شہید کر دیئے جاتے، تو آپؑ اس کا بھی استقبال کرتے،کیونکہ آپؑ کا ہدف و مقصد خود اس قیام سے ہی پورا ہو گیا تھا۔

بنابر ایں میں اس تیسرے نظریے کا قائل ہوں کہ شہید ہو جانا یا حکومت کی باگ ڈور سنبھال لینا،کوئی بھی امام حسین علیہ السلام کے اہداف و مقاصد میں سے نہیں تھا؛ بلکہ آپؑ کا ہدف و مقصد یہ تھا کہ خود یہ مزاحتمی تحریک اور قیام وجود میں آئے، کیونکہ خود اِس تحریک کا وجود میں آنا، اُس وقت کے مسلمانوں اور طولِ تاریخ میں دنیا میں آنے والے تمام مسلمانوں کے لیے ایک نمونہ اور اُسوۂ حسنہ تھا۔ یہ مزاحمتی تحریک، اسلامی نظام میں موجود ایک (بہت بڑے) خلاء کو پُر کر دیتی۔ یہ وہی چیز تھی جس کی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم دی تھی اور فرمایا تھا کہ جب تم یہ دیکھو کہ دنیا ویرانی اور بربادی کی طرف جا رہی ہے اور اسلامی نظام فساد کا شکار ہو رہا ہے، تو ضروری ہے کہ (اس کے مقابلے میں) قیام کرو اور تحریک کا آغاز کرو؛ اس بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما چکے تھے۔ لیکن خود آنحضرتؐ طبیعی طور پر اِس

الٰہی وظیفے پر عمل نہیں کر سکتے تھے؛ کیونکہ خود حضور اکرمﷺ کے زمانے میں موضوع ہی محقق نہیں ہوا تھا؛ یعنی ایسا انحراف اور بیگاڑ ہی وجود میں نہیں آیا تھا۔ اِس عمل کو بھی ضرور انجام پانا چاہیے تھا۔ پیغمبر اکرمﷺ نے نماز سکھائی تھی، زکات سکھائی تھی، حج اور جہاد کے بارے میں بھی (مسلمانوں کو) احکامات بتائے تھے اور خود اِن سب پر عمل کرکے بھی دکھایا تھا؛ لیکن اِس کام کو آپؐ کے جانشینوں میں سے کسی ایک نے انجام دینا تھا، اسے بھی لوگوں کو سکھانا (اور انجام دے کر دکھانا) تھا اور امام حسینؑ نے یہ کام انجام دیا۔

پس ہم بطورِ خلاصہ بیان کرتے ہیں کہ امام حسین ابن علیؑ کا ہدف و مقصد یہ تھا کہ یہ قیام اور مزاحمتی تحریک انجام پائے، تاکہ اِس تحریک کے انجام دینے کی برکت سے، پوری انسانیت، آئندہ تاریخ میں آنے والے مسلمان اور خود اس وقت کے مسلمان، ایسی صورتِ حال اور اوضاع و احوال کے مقابلے میں اپنے وظائف اور ذمہ داریوں کو سمجھیں اور جان لیں کہ جب ظلم حکومت کرے، جب کفر حکومت کرے اور جب اسلامی نظام فساد و انحراف کی طرف بڑھ رہا ہو اور (اس بات کا خوف ہو کہ) یہ ریل گاڑی جلد ہی اپنی پٹری سے اُتر جائے گی، تو وظیفہ کیا ہے؟

قیامِ امام حسینؑ کا بنیادی ہدف و مقصد

حضرت امام حسینؑ کا ہدف و مقصد، سخت ترین اور دُشوارترین شرائط میں ایک الٰہی وظیفے کو انجام دینے سے عبارت ہے، تاکہ لوگوں کو سکھائیں، تاریخ کو (جاودانی) پیغام دیں اور تمام نسلوں کو یہ سکھائیں کہ جب صورتِ

حال اس قسم کی ہو تو عمل اور ردِّعمل بھی اِس طرح کا ہونا چاہیے؛ آپؑ یہ چیز سکھانا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ مزاحمتی تحریک اور قیام کرنے کو اور دُشوار و سخت مبارزہ آرائی کو تاریخ میں رقم کریں؛ درحقیقت تاریخ میں امام حسین علیہ السلام کے جاودانی اور زندہ و جاوید ہونے کا راز بھی یہی ہے۔

البتہ اِس قسم کی مزاحمتی تحریک کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں: ایک نتیجہ تو شہید ہو جانا ہے اور دوسرا نتیجہ کامیابی و کامرانی ہے، اس کے علاوہ کوئی تیسرا نتیجہ نہیں ہے۔ جب انسان کوئی تحریک چلاتا ہے اور قیام کرتا ہے تو (پوری) قدرت اور طاقت کے ساتھ جدّ و جہد اور مبارزہ آرائی کرتا ہے، نتیجے میں یا تو کامیاب ہو جاتا ہے اور حکومت تشکیل دیتا ہے، جیسا کہ کئی ایک مواقع پر ایسا ہوا ہے، بنی عباس کے دورِ حکومت میں بعض علویوں کی اعتراض آمیز بغاوتوں اور مبارزہ آرائیوں کا یہی نتیجہ نکلا کہ وہ (بعض علاقوں میں) حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئے اور بعض نے کتنے ہی سالوں تک حکومت بھی کی؛ یا نہیں، اس کا نتیجہ شہادت کی صورت میں نکلتا ہے؛ اِن دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، جو چیز اہم ہے وہ نتیجہ نہیں، بلکہ خود عمل (اور اِس وظیفے پر عمل کرنا) ہے، قیام کرنا ضروری ہے اور یہ وہی پیغام ہے جسے ہمارے لوگوں نے (اِس قیام سے) سیکھا ہے۔

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ انقلاب نے ہمیں عاشورا کو سمجھایا ہے اور اِس حسینیؑ واقعے کی ہمارے لیے وضاحت کی ہے، اس کا یہی مطلب ہے۔ ہم اِس بات کو نہیں جانتے تھے، اِس کا احساس بھی نہیں کرتے تھے؛ لیکن انقلاب کے دوران، ہمارے (انقلابی) لوگ اِس بات کو سمجھ گئے اور انہوں نے درک کر لیا کہ اِس صورتِ حال اور وضعیت کے مقابلے میں جو ہم

پر حاکم ہے اور اِس طاغوتی حاکمیت کے مدِّمقابل ہمارا وظیفہ اور ذمہ داری کیا ہے؟ وظیفہ یہی تھا کہ لوگ قیام کریں اور میدانِ عمل میں آ جائیں؛ لوگوں نے قیام کیا اور پروردگارِ عالم کے فضل و کرم سے، جو نتیجہ ہماری قوم کے لیے سامنے آیا، وہ وہی «اِحدَی الحُسنَیَین»[1] تھا۔ وہی چیز تھی کہ اگر امام حسین علیہ السلام کے قیام کے نتیجے میں بھی سامنے آ جاتی تو دنیا کی تاریخ ہی بدل جاتی۔ ظلم و ستم کا دنیا سے کم از کم ایک طویل مدّت کے لیے خاتمہ ہو جاتا۔ دنیا بھر میں عدل و انصاف کا بول بالا ہوتا اور اسلام پورے عالم پر چھا جاتا۔ لیکن افسوس یہ چیز پیش نہ آئی اور امام حسین ابن علی علیہما السلام شہید کر دیئے گئے۔ روایات کے مطابق، جب امام حسین علیہ السلام شہید کر دیئے گئے: «اِشتَدَّ غَضَبُ اللهِ تَعالَی عَلَی اَهلِ الاَرضِ»[2] خدا وند متعال کا غیظ و غضب زمین کے گناہگار اور حق ناشناس لوگوں پر اس قدر شدید ہو گیا کہ عالم الغیب نے اپنی تقدیر و مشیئت میں اس قسم کی تحریک اور قیام کے امکانات کچھ عرصہ کے لیے پھر تاخیر میں ڈال دیئے۔ ائمہ اطہار علیہم السلام کی زندگی کے باب میں ایک قابلِ تعریف و توصیف اور شیرین بحث و گفتگو یہی ہے کہ سال ستر (۷۰) ہجری قمری اور سال ایک سو چالیس (۱۴۰) ہجری قمری کو روایات میں، حق کی باطل پر فتح اور امامت و حکومتِ اسلامی کی تشکیل کے لیے بعض موارد میں پیشگوئی کے طور پر بیان کر دیا گیا تھا۔

بنا بر ایں امام حسین علیہ السلام کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ آپؑ چاہتے تھے کہ قیام کریں اور (اس طرح) قیام کرنے کی لوگوں کو تعلیم دیں اور امام حسین علیہ السلام کا پیغام بھی بہت واضح پیغام ہے۔ جی ہاں! امام عالی مقام علیہ السلام کی تحریک

۱۔ ''ان دو نیکیوں میں سے ایک نیکی''؛ سورۂ مبارکہ توبہ، آیت ۵۲۔

۲۔ امام جعفر صادق علیہ السلام، کافی، کتاب الحجۃ، باب کراہیۃ التوقیت، حدیث ۱۔

اور قیام، ایک بولتا (اور حق کی آواز بلند کرتا) قیام ہے، ایک ایسا قیام ہے جو تاریخ میں اب تک ہمارے لیے باقی رہا ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں اور اصحاب کے ساتھ، اپنے دشمنوں کے ساتھ، غیر جانبدار اور لاپرواہ لوگوں کے ساتھ، تعصّب روا رکھنے والوں کے ساتھ، ساتھ رہنے والوں اور ساتھ چھوڑ جانے والوں کے ساتھ؛ سب کے ساتھ آپؑ نے گفتگو کی ہے اور اپنا ہدف و مقصد بیان کیا ہے۔ آپ لوگ ذرا توجہ کریں، میں امام حسین علیہ السلام کے کلماتِ گوہربار کے کچھ حصّے آپ کی خدمت میں پڑھتا ہوں؛ یہ کلمات واقعۂ عاشورا کی وضاحت کرتے ہیں۔

جب معاویہ دنیا سے چل بسا اور اس نے یزید کو اپنے جانشین کے عنوان سے پہلے ہی سے متعارف کروا دیا تھا -البتہ جس وقت معاویہ (اپنی زندگی ہی میں) یزید کی اپنے جانشین کے طور پر معرّفی کرنا چاہ رہا تھا، امام حسین ابن علی علیہما السلام نے (اُس وقت بھی) اس کی مخالفت کی تھی- ولید ابن عتبہ نے امام حسین علیہ السلام کو دارالعمارہ آنے کی دعوت دی اور کہلوا بھیجا کہ ہمیں آپؑ سے کام ہے، امام حسین علیہ السلام نے (مسجد میں) مدینہ منورہ کی مشہور و معروف شخصیات کو جمع کیا اور اُن سے فرمایا: ''میرا خیال ہے کہ بات اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ معاویہ مر چکا ہے اور یہ لوگ ہمیں (دارالعمارہ) بُلا کر (یزید کی) بیعت لینے کے مقدّمات فراہم کرنا چاہتے ہیں۔'' یہی وجہ تھی کہ (دوسرے دن) امام حسین علیہ السلام پوری تیاری کے ساتھ گورنر کے یہاں تشریف لے کر گئے تھے۔ وہاں صورتِ حال بھی کچھ اسی طرح کی تھی۔ انہوں نے امام حسین علیہ السلام کو اسی لیے بُلایا تھا تاکہ آپؑ سے بیعت لے لیں۔ ولید ابن عتبہ پورے حجاز کا والی اور حاکم تھا اور مروان ابن حکم جو مدینہ میں مستقر تھا، وہ اس کا نمائندہ تھا۔ انہوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام

سے بیعت کا مطالبہ کیا تو حضرتؑ نے چاہا کہ فی الحال اس بات کو تاخیر میں ڈال دیں۔ اس لیے فرمایا: ''کل کا انتظار کرو، دیکھیں اِس بارے میں ہم کیا (فیصلہ) کرتے ہیں اور اگر بیعت کرنا ہی مقصود ہوا تو سب لوگوں کے سامنے ہو گی۔'' جس وقت آپؑ باہر تشریف لے جانا چاہتے تھے، تو مروان ابن حکم نے (ولید ابن عتبہ کو) اشارہ کیا اور کہا کہ کیا تم حسینؑ کو جانے کی اجازت دے رہے ہو! (جان لو!) اگر حسینؑ یہاں سے چلا گیا تو پھر تمہارے ہاتھ ایسا (سنہری) موقع نہیں آئے گا، بہتر یہی ہے کہ یہیں حسینؑ پر دباؤ ڈال کر ابھی اِس سے بیعت لے لو۔ امام حسین علیہ السلام (غیظ و غضب کی حالت میں) پلٹے اور مروان کی طرف رُخ کرکے سخت اور تیز لہجے میں فرمایا: «وَمِثلی لایُبایِعُ مِثلَهُ»[1] ''کون مجھ سے زبردستی بیعت لے سکتا ہے؟ تو یا ولید؟ مگر تم ایسا کر سکتے ہو؟ خدا کی قسم! تم ایسا کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے اور اچھی طرح جان لو کہ ''مجھ جیسا کوئی بھی شخص، یزید جیسے کسی بھی شخص کی ہر گز بیعت نہیں کرے گا۔'' اب کیا یہ ممکن ہے کہ میں بیعت کروں؟ لیکن اب ہم صبح تک صبر کرتے ہیں: «لَکِن نُصبِحُ وَتُصبِحُونَ وَنَنظُرُ وَتَنظُرُونَ» اور دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔'' یہاں بھی امام حسین علیہ السلام نے اس مناسب فرصت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور خود اپنی اور اپنے تمام ساتھیوں اور اصحاب کی سلامتی کے پیشِ نظر، سب کو مکہ کی طرف لے چلے اور اپنے آپ کو اس عظیم قیام (اور الٰہی تحریک) کے لیے تیار کرنے لگے۔ دارالعمارہ سے واپس آنے کے بعد اسی رات آپؑ نے مدینہ سے اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔

مجھے صحیح یاد نہیں کہ اسی موقعہ پر دارالعمارہ میں یا شاید وہاں سے باہر تشریف لانے کے بعد، امام حسین علیہ السلام اور مروان کے درمیان، یزید کے

۱۔ بحار الانوار، تتمہ کتاب ''تاریخ فاطمہ و الحسن و الحسین علیہم السلام''، باب۳۷، حدیث۲۔

بارے میں بھی کچھ گفتگو ہوئی ہے۔ مروان نے کہا: اے حسین ابن علی! میں یہی مصلحت سمجھتا ہوں کہ آپ (یزید کی) بیعت کر لیں اور اپنے لیے مشکلات کھڑی نہ کریں اور اس کام کو انجام پا لینے دیں۔ (اُس کی باتیں سن کر) امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: «اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیهِ رَاجِعُوْنَ وَعَلَی الْاِسْلَامِ السَّلَامُ اِذْ قَدْ بُلِیَتِ الْاُمَّةُ بِرَاعٍ مِثل یَزِیدَ»[1] یہ وہی انحراف اور بیگاڑ ہے اور یہ وہی صورتِ حال ہے کہ جس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے کہ ایک نظام میں ممکن ہے کہ کسی وقت ایسا انحراف اور بیگاڑ پیدا ہو جائے؛ یعنی «اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیهِ رَاجِعُونَ» یہ حالت (اور گفتار) خوف و دہشت کی انتہاء کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ کلمۂ استرجاع مکمل پریشانی اور نگرانیِ خاطر کی علامت ہے؛ یعنی اس وقت کس قدر پریشان حال اور دہشت زدہ ہوا جا سکتا ہے جس وقت اُمتِ اسلامی یزید جیسے (نا اہل) حکمران کی رعیّت شمار ہو، «وَعَلَی الْاِسْلَامِ السَّلَامُ اِذْ قَدْ بُلِیَتِ الْاُمَّةُ بِرَاعٍ مِثل یَزِیدَ» امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں: جس وقت لوگ یزید جیسے چرواہے کے حال پر چھوڑ دیئے جائیں؛ یعنی بھیڑوں کے گلے کو چرواہے کے بجائے کسی بھیڑیے کے حوالے کر دیا جائے، «وَعَلَی الْاِسْلَامِ اَلسَّلَامُ» تو اُس وقت ایسے اسلام کو خدا حافظ ہی کہہ دینا چاہیے۔ ایسے میں اسلامِ اصیل کی تو کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، یعنی امام حسین ابن علی علیہما السلام کا ہدف و مقصد اسلام کا احیاء اور زندہ کرنا ہے۔

حسین ابن علی علیہما السلام کو خود یزید کے ساتھ کوئی ذاتی و شخصی مسئلہ یا اختلاف نہیں تھا، یعنی امام حسین علیہ السلام کے لیے یزید اور غیر یزید میں انسان ہونے کے ناطے کوئی فرق نہیں تھا۔ البتہ فاسد اور فاسق ہونے کے حوالے سے امام حسین علیہ السلام کی نظر میں یزید ایک نا اہل اور غیر شائستہ شخص تھا؛ لیکن

۱۔ بحار الانوار، تتمہ کتاب "تاریخ فاطمہ و الحسن و الحسین علیہم السلام"، باب۳۷، حدیث۲۔

جب یہی فاسد و فاسق شخص (یزید) مسلمانوں کا خلیفہ اور پیغمبر اکرمﷺ کا جانشین بن جائے تو خطرے کی گھنٹی بجنے لگتی ہے اور امام حسینؑ یہیں سے یہ احساس کرتے ہیں کہ اُس انحراف اور بیگاڑ کا آغاز (جس کے بارے میں پیغمبر اکرمﷺ نے پیشگوئی فرمائی تھی) ہو گیا ہے یا وہ انحراف و بیگاڑ اب اپنی انتہاء کو پہنچ چکا ہے۔ کیونکہ شاید یہ اُس انحراف کا آغاز نہیں، بلکہ اُس کا نقطۂ اوج ہے، جس کی طرف آنحضرتؐ نے اشارہ فرمایا تھا، ایک اور روایت، جس کا ہم بعد میں تذکرہ کریں گے خود امام حسینؑ پیغمبر اکرمﷺ کے قول کو نقل کرتے ہیں اور یہی وہ وقت ہے جب تحمل اور برداشت کی حدّ ختم ہو جاتی ہے اور جس قدر تحمل کیا جا سکتا تھا، ہو چکا اور اب بس! اب مزید تحمل اور برداشت کی گنجائش ہی نہیں ہے اور اب قیام ضروری ہو گیا ہے۔

جب اُس دن مدینہ کا گورنر امام حسینؑ سے بیعت نہ لے سکا تو کہنے لگا: ٹھیک ہے آج آپ تشریف لے جائیں، لیکن کل یا بعد میں (بیعت کے لیے) آجائیں۔ امام عالی مقامؑ وہاں سے تشریف لائے اور اسی رات مدینہ سے روانگی کے اسباب فراہم کیے اور رات کی تاریکی میں مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ جب آپؑ نے دیکھا کہ کوئی اور جگہ مکہ معظمہ سے زیادہ مناسب نہیں ہے تو آپؑ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ مکہ معظمہ میں بھی امام حسینؑ نے اپنی ایک یادگار سند اور اپنا ایک خط چھوڑا ہے جو آپؑ کی (اپنے بھائی) محمد ابن حنفیہ کو وصیت ہے، جس میں آپؑ وصیت کے مقدّمات بیان کرتے ہیں: «هَذا مَا أَوْصَى بِهِ الْحُسَينُ بْنُ عَلِيّ بْنِ اَبِي طَالِبٍ اِلَى اَخِيهِ مُحَمَّدٍ الْمَعْرُوفِ بِابْنِ الْحَنَفِيَّةِ»[1] اور پھر پروردگارِ عالم کی وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں، جیسے

۱۔ بحار الانوار، تتمہ کتاب "تاریخ فاطمہ و الحسن و الحسینؑ"، باب۳۷۔

اکثر ہمارے وصیت ناموں میں ہوتا ہے کہ پہلے خدا وند متعال کی وحدانیت کی گواہی اور پیغمبر اکرمﷺ کی نبوّت و رسالت کی گواہی وغیرہ ہوتی ہے؛ آپؑ بھی اسی طرح ابتداء فرماتے ہیں تاکہ اس وقت کی تبلیغاتی اور پروپیگنڈہ مشینری آپؑ پر بہتان تراشی اور تہمت کا بازار گرم نہ کر سکے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: «وَاَنّی لَمْ اَخْرُجْ اَشِراً وَلَا بَطِراً وَلَا مُفسِداً» میں جو اس وقت مدینہ سے نکلا ہوں، میرا یہ مدینہ سے نکلنا، غرور و تکبُّر اور خود پسندی کی وجہ سے نہیں ہے کہ میں یزید کو انسان نہیں سمجھتا یا خود پسند اور خود خواہ ہوں؛ یہ کوئی ذاتی مسئلہ نہیں ہے یا احساسات و جذبات کی بات نہیں ہے، میرا یہ مدینے سے نکلنا ظلم کی خاطر بھی نہیں ہے اور نہ ہی میں فتنہ و فساد برپا کرنا چاہتا ہوں؛ کیونکہ اکثر حکومتوں کے معاملے میں اور طولِ تاریخ میں ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ ایک حکومت برسرِاقتدار ہوتی ہے، لیکن کچھ لوگ جو خود خواہ اور اقتدار پسند ہوتے ہیں اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہتے ہیں، بغیر کسی دلیل و برہان کے اور بغیر کسی عذر و بہانے کے اچانک قد عَلَم کرتے ہیں؛ کچھ لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں، ظلم و ستم کا بازار گرم کرتے ہیں؛ بالکل ایسے ہی جیسے آج کل ہو رہا ہے اور آپ برادران و خواہران ملاحظہ فرما رہے ہیں؛[1] ایک حکومت اقتدار میں ہے، اپنا کام (صحیح طرح سے) کر رہی ہے، اِن کے پاس حکومت کی نسبت کوئی اصولی اور منطقی اعتراض بھی نہیں ہے، اس کے باوجود اختلافی مسائل کو ہوا دینا شروع کر دیتے ہیں اور پھر سڑکوں اور خیابانوں پر آکر مثلاً بم دھماکے کرتے ہیں، ایک تعداد میں لوگوں کو اِن دھماکوں سے نشانہ بناتے ہیں؛ یہ تو سراسر ظلم ہے۔ اِن میں سے بعض کسی شہر، کسی قصبے اور دیہات میں چلے

۱۔ سال ۱۳۶۱ شمسی میں منظّم قتل و غارتگری کے حالات و واقعات کی طرف اشارہ۔

جاتے ہیں اور کوئی (اختلافی) مسئلہ چھیڑ دیتے ہیں، کسی قسم کا فتنہ و فساد برپا کرتے ہیں، یہ بھی تو فساد (اور مفسد فی الارض) کے زُمرے میں ہی آئے گا۔ امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں: ''میرے اِس قیام کو اِس طرح کے کاموں سے مشابہ نہ سمجھو؛ میں جو مدینہ سے نکلا ہوں تو میرا (یزید کے ساتھ) کوئی ذاتی، شخصی اور جذباتی و احساساتی مسئلہ نہیں ہے اور (میرا یہ قیام) ظلم و فساد برپا کرنے کے لیے بھی نہیں ہے۔''

ابھی امام حسین علیہ السلام نے مکہ نہیں چھوڑا تھا، بلکہ یہ اُس وقت کی بات ہے جب امام عالی مقام علیہ السلام مدینہ سے باہر تشریف لائے تھے، لیکن یہاں جو مسئلہ (اور اصل بحث) ہے، وہ قیام اور خروج ہے، مسئلہ ایک اقدام کے بجالانے کا ہے، نہ کہ (مکہ جا کر) حرمِ امنِ الٰہی میں پناہ لینے کا؛ اس لیے امامؑ لفظِ «اَخْرُجْ» سے تعبیر فرماتے ہیں، جس کا معنی، اُس وقت کی رائج لغت اور ثقافت میں ''خروج اور قیام کرنا'' ہے، اگر امام عالی مقام علیہ السلام کا مقصد مکہ جا کر پناہ لینا اور وہیں ٹھہر جانا ہوتا، تو آپؑ اس تعبیر کو استعمال نہ کرتے۔ آپؑ فرماتے ہیں: «لَمْ اَخْرُجْ اَشِراً وَلَا بَطِراً» ہمارا یہ قیام، ہمارا یہ خروج اور ہماری یہ مزاحمتی تحریک؛ تکبُّر، خود پسندی اور قدرت طلبی یا اُن کاموں کی مانند نہیں ہے جو کام دنیا میں فتنہ و فساد برپا کرنے والے اور ظالم و ستمگر لوگ کرتے ہیں۔ ہم ظلم و ستم کا بازار گرم کرنے اور فتنہ و فساد برپا کرنے نہیں آئے ہیں، بلکہ ہمارا ہدف و مقصد کوئی اور چیز ہے۔

پس ہم نے کیوں قیام کیا ہے؟ «وَاِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِی اُمَّةِ جَدِّی» میں اس لیے خارج ہوا ہوں تاکہ اپنے نانا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کی اصلاح کروں؛ یعنی وہ فساد اور بیگاڑ جو پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت میں پیدا

ہو چکا ہے، اس فساد کو ختم کروں؛ یعنی وہی صورتِ حال جس کی پیغمبر اکرمؐ پیشگوئی کرتے تھے اور اس کا حکم بھی معین فرماتے تھے؛ وہ فساد یعنی یہی انحراف اور بیگاڑ، امامؑ فرماتے ہیں: یہ انحراف اور بیگاڑ جو پیدا ہو چکا ہے، اس انحراف کو میں دُور کروں گا: «اُرِيْدُ اَنْ آمُرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَنْهٰى عَنِ الْمُنكَرِ» میں چاہتا ہوں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کروں؛ یعنی اس قیام اور تحریک کی حقیقت اور روح، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بُرائیاں جو معاشرے میں پائی جاتی ہیں، لوگوں کو ان کے انجام دینے سے روکوں اور وہ خوبیاں جو اسلام میں موجود ہیں، لوگوں کو اِن کی طرف دعوت دوں اور انجام دینے کا حکم دوں۔ «وَاَسِيْرَ بِسيرَةِ جَدّى وَأَبِي عَلِيِّ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ» **اُسی اپنے نانا رسول اللہؐ اور اپنے بابا علی ابن ابیطالب علیہ السلام کی سیرت کو، یعنی اُسی اسلامی امامت و رہبری کو، اُسی خدا کی حاکمیت کو، لوگوں کے درمیان دوبارہ زندہ کروں؛ درحقیقت امام حسین علیہ السلام کا ہدف و مقصد یہ ہے۔**

وظیفے کی انجام دہی میں دوسروں کو دعوت

امام حسین علیہ السلام کے قیام کی حقیقت یہ چیز ہے، لہٰذا امام حسین علیہ السلام مدینہ سے اپنے اِس قیام کا آغاز فرماتے ہیں اور مکہ معظمہ تشریف لے آتے ہیں، امام عالی مقام علیہ السلام (چند ماہ مکہ میں اپنے قیام کے دوران) مکہ سے کوفہ کے لوگوں کے ساتھ خط و کتابت کرتے ہیں۔ جب طے ہے کہ کوئی تحریک چلائی جائے تو اس تحریک اور قیام کا معنی یہ نہیں ہے کہ انسان تنِ تنہا جائے اور شہید ہو جائے؛ یعنی ایسا کام کرے کہ جس کا کوئی اثر اور فائدہ ہی نہ ہو

اور بعد میں کوئی نتیجہ بھی برآمد نہ ہو؛ نہیں، بلکہ ہدف و مقصد یہ ہے کہ امام حسین ابن علی علیہما السلام کی طرف سے ایسی تحریک چلائی جائے (اور ایسا قیام عمل میں آئے) جو اُموی اور یزید کے تختِ حکومت کی چولیں ہلا کر رکھ دے؛ اگرچہ اس کے نتیجے میں خود امام عالی مقام علیہ السلام درجۂ شہادت پر فائز ہو جائیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی تحریک چلائی جائے جو یزید کی حکومت اور اس کے ظالم، فاسد اور باطل و سرکش نظام پر کاری ضرب لگائے۔ امام عالی مقام علیہ السلام کچھ اس قسم کا عظیم کام انجام دینا چاہتے ہیں اور معلوم ہے کہ اس کام کے لیے افرادی اور عسکری قوت و طاقت فراہم ہونا ضروری ہے، اس کام کا انحصار اس بات پر ہے کہ کچھ لوگ جمع ہو جائیں اور امکانات و جنگی ساز و سامان بھی فراہم ہو جائے؛ اس لیے امامؑ خط و کتابت شروع کرتے ہیں۔ دوسری طرف کوفہ- جو اس وقت شیعوں کا مرکز تھا- کے شیعہ اور امیر المومنین علی علیہ السلام کے اصحاب، جو امام عالی مقام علیہ السلام سے بخوبی آشنا تھے اور انہوں نے مختلف جنگوں میں آپؑ کے ہمرکاب ہو کر جنگ لڑی تھی؛ جیسے جناب حبیب ابن مظاہر اور اس قسم کی اسلامی معاشرے کی مشہور و معروف شخصیات، جو کوفہ میں موجود ہیں، شہرت کی حامل ہیں اور عام لوگ ان کے تابعِ فرمان اور ان سے محبت کرنے والے ہیں، انہوں نے امام حسین علیہ السلام کو خطوط لکھے کہ آپؑ کوفہ آ جائیں، ہم آپؑ کی حمایت (اور مدد و نُصرت) کرنے کے لیے آمادہ و تیار ہیں اور اُموی حکومت کے خلاف قیام کریں گے۔

البتہ اِن خطوط کا انداز اور لب و لہجہ مختلف قسم کا ہے؛ بعض خطوط میں اس طرح سے ہے کہ آپؑ کا دشمن دنیا سے چل بسا ہے اور اس بات کے امکانات کہ آپؑ حکومت کو دوبارہ اسلام کی پٹری پر لے آئیں گے، بہت

زیادہ ہیں، لہٰذا آپؑ واپس لوٹ آئیں۔ بعض خطوں میں ہے کہ کوفہ کی نہریں جاری ہو گئی ہیں، درختوں نے پھل دینے شروع کر دیئے ہیں، کوفہ کی خوش آب و ہوا طبیعت کو امام حسین علیہ السلام کے لیے بیان کرنا اور تصویر کشی کرنا شروع کرتا ہے۔ یہ چیزیں پیغام رسانی اور نامہ نگاری کرنے والے شخص کی فکری، ذہنی اور عقل و شعور کی سطح سے تعلق رکھتی ہیں؛ بعض کی فکر اُس (اعلیٰ اور عمدہ) سطح کی ہوتی ہے، تو وہ اسی طرح خط بھی لکھتے ہیں؛ جبکہ بعض کی فکر عامیانہ اور سطحی ہوتی ہے تو وہ امام عالی مقام علیہ السلام کو پھل وغیرہ کھانے، خوش آب و ہوا مقام پر وقت گزارنے اور استراحت کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور خط بھی اسی انداز میں لکھتے ہیں۔ یہ خطوط (کتابوں میں) موجود ہیں، ہر طرح کے ہیں، اب اِن کی تعداد کتنے ہزار ہے، بعض اوقات تو ایک بہت بڑی تعداد مبالغہ آرائی کی حدّ تک بیان کی جاتی ہے، مثلاً بیس (۲۰) ہزار یا ستّر (۷۰) ہزار خطوں تک کی تعداد نقل ہوئی ہے جو کہ شاید مبالغہ کی حدّ تک ہی ہو سکتی ہے اور احتمال یہی ہے کہ خطوط کی تعداد اِس سے بہت کم رہی ہوگی۔ بہرحال ایک بڑی تعداد میں مکہ میں قیام کے دوران امام عالی مقام علیہ السلام کو یہ خطوط ملے اور انہی خطوط کی بنیاد پر امامؑ نے بالآخر مکہ کو چھوڑنے کا ارادہ کیا۔

تمام وہ لوگ جو مکہ اور مدینہ میں مشہور و معروف لوگ تھے اور اس معاملے کی حقیقت اور نزاکت کو نہیں سمجھتے تھے، انہوں نے امام عالی مقام علیہ السلام کے اِس عمل کی مخالفت کی، ابنِ عباس، محمد ابن حنفیہ، عبد اللہ ابن جعفر -آپؑ کی بہن حضرت زینبِ کبریٰ علیہا السلام کے شوہر- اور دوسرے بہت سے لوگوں نے (آپؑ کے قیام کی) مخالفت کی۔ **بہت سی ایسی شخصیات تھیں جو سب کی سب، یا اُن میں سے اکثر -نہ سب کی سب- اچھی صفات کی مالک تھیں، لوگ اُن**

کی بات کو قبول کرتے تھے اور وہ قابلِ احترام افراد تھے؛ اِن میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے امام حسین علیہ السلام کے ساتھ بحث و گفتگو بھی کی تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ امام حسین علیہ السلام کربلا جائیں؛ اپنی محبت اور امام حسین علیہ السلام سے اپنی وابستگی کی وجہ سے! جیسے محمد ابن حنفیہ، آپؑ کے بھائی؛ جیسے عبد اللہ ابن جعفر، آپؑ کے بہنوئی؛ جیسے عبد اللہ ابن عباس، آپؑ کے چچا زاد بھائی؛ جیسے عمر ابن علیؑ، آپؑ کے بھائی اور ان جیسے دوسرے بہت سے لوگ؛ جیسے جناب ام سلمہ، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ اور دوسرے افراد جو امام حسین علیہ السلام کے ساتھ بحث و گفتگو کرتے تھے، اپنی محبت و اُلفت کا اظہار کرتے تھے، انہوں نے خود بھی معاویہ اور یزید کے ساتھ مبارزہ آرائی اور مقابلہ کیا تھا، لیکن حاضر نہیں تھے کہ امام حسین علیہ السلام کے اِس قیام کو قبول کریں، نہ تو خود اِس قیام کا حصّہ بننے کے لیے تیار تھے اور نہ ہی اجازت دیتے تھے کہ امام حسین علیہ السلام اس کام کو انجام دیں۔ امام حسین علیہ السلام کا اُن کے ساتھ فرق اسی چیز میں تھا کہ وہ صرف باتیں کرنے پر ہی اکتفاء کرتے تھے۔

ہاں عبد اللہ ابن عباس، اگرچہ نہج البلاغہ اور تاریخ کی دوسری معتبر کتابوں کی نقل کے مطابق، حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے دور میں، حضرتؑ اور ابن عباس کے درمیان کوئی مسئلہ پیش آیا تھا، لیکن ہرگز کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں ہے کہ عبد اللہ ابن عباس، امیر المومنین علیہ السلام اور خاندانِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وفادار نہیں تھے اور مجھے اس بات میں کوئی شک و تردید نہیں ہے۔ میں نے جس قدر بھی تاریخ میں عبد اللہ ابن عباس کی گزشتہ اور واقعۂ عاشورا کے بعد کی زندگی پر نظر کی ہے، اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ عبد اللہ ابن عباس، خاندانِ پیغمبرؐ کے مخلص و مرید اور ان کے مخالفین کے مخالف تھے۔ وہ معاویہ و یزید دونوں کے ساتھ بُرے طرزِ عمل

سے پیش آتے تھے اور یزید کے بعد آنے والے خلفاء کے ساتھ بھی مبارزہ آرائی اور مقابلے کی کیفیت میں رہتے تھے۔

یا مثلاً عبد اللہ ابن جعفر؛ البتہ عبد اللہ ابن جعفر، عبد اللہ ابن عباس کی طرح سخت موقّف کے حامل نہ تھے، عبدا للہ ابن جعفر، علمی شخصیت ہونے اور تقویٰ و پرہیزگاری کے لحاظ سے بھی عبد اللہ ابن عباس کی مانند نہیں تھے، نہ تو مکہ میں، نہ مدینہ میں اور نہ ہی تاریخ اسلام میں اس کے بعد، وہ اس پائے کی شخصیت نہیں تھے؛ لیکن بہرحال اس میں شک نہیں کہ وہ امام حسین علیہ السلام سے محبت کرتے تھے اور آپؑ کے مخلص و ہمدرد تھے اور چاہتے تھے کہ امام حسین علیہ السلام کسی بڑی مشکل میں گرفتار نہ ہوں۔

یا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ، جناب اُم سلمہ، وہ بھی اسی طرح، اگرچہ ایک بوڑھی (اور نیک) خاتون تھیں، پیغمبرؐ کی شریکِ حیات تھیں اور امام حسین علیہ السلام سے پیار کرتی تھیں، یہ سب لوگ وہ تھے جنہوں نے امام حسین علیہ السلام کو اِس قیام اور اس راستے پر جانے سے روکا، جس کا امام عالی مقام علیہ السلام ارادہ رکھتے تھے۔

حتی کہ بعض لوگوں نے، جب امام حسین علیہ السلام کربلا یا کوفہ کی جانب سفر پر روانہ ہو چکے تھے، تو دورانِ سفر آپؑ کو خط لکھے اور آپؑ سے اِس خواہش کا اظہار کیا کہ واپس لوٹ آئیں، یعنی ایک بار پھر خط لکھ کر اِس قیام کے ارادے اور مقصد کو چھوڑ دینے کی خواہش کی اور مایوس نہیں ہوئے، کیوں؟ اس لیے کہ ان لوگوں نے غور و فکر کیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ کام (اور یہ قیام) جس مقصد کے لیے انجام دیا جا رہا ہے، اگر وہ اس لیے ہے کہ امام حسین علیہ السلام حکومت حاصل کر لیں تو (اس وقت) اس کی

شرائط مفقود ہیں، بہت سی وہ چیزیں جن کا (حصولِ حکومت کے لیے) ہونا ضروری ہے، وہ موجود ہی نہیں ہیں۔ اگر چنانچہ خود یہ قیام اور یہ مزاحمتی تحریک ہی مطلوب ہے اور مقصود لوگوں کو اِس طرح کا قیام اور تحریک یاد دینا اور سکھانا ہے اور مقصد اپنے زمانے کے اور بعد میں آنے والے لوگوں کو بیدار کرنا ہے، تو اس راہ میں شہادت مقدّر ہے؛ جبکہ یہ وہ لوگ تھے جو اس طرح اپنے آپ کو شہادت تک لے جانے کے لیے تیار نہیں تھے، ان میں اس طرح کی ہمت و طاقت ہی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ خط لکھتے تھے، بہانہ تراشیاں کرتے تھے اور امام عالی مقامؑ کو اس کام سے منع کرتے تھے؛ لیکن امامؑ نے ان سب نصیحتوں اور ان کے خیال میں خیرخواہانہ اور عاقلانہ مشوروں کے باوجود، قیام فرمایا۔

امام حسینؑ کے قیام کا ہدف و مقصد یہ تھا کہ آپؑ پوری دنیا کے لوگوں کو، اُس وقت کے مسلمانوں کو اور تاریخ میں آنے والے تمام مسلمانوں کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ جب اسلامی معاشرے اور اسلامی نظام کی صورتِ حال اس حدّ تک پہنچ جائے کہ نظام کی باگ ڈور ایک (عادل) امام کے بجائے ایک (ظالم و جابر) سلطان کے ہاتھ میں آجائے؛ تو وظیفہ قیام کرنا اور تمام ممکنہ وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے مقابلہ، مبارزہ اور مزاحمتی تحریک چلانا ہے۔ اگر تلوار کے ساتھ ممکن ہے تو تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ فقط زبان پر اکتفا کرو۔ اگر تند و تیز اور سخت زبان سے ممکن ہے، تو نرم و ملائم زبان کے ساتھ جائز نہیں ہے اور ضروری ہے کہ جو بھی آپ کے پاس محکم ترین اور قوی ترین وسائل اور ذرائع موجود ہیں، ان کے ساتھ یہ اقدام اُٹھائیں، چاہے اس اقدام کا نتیجہ جو بھی نکلے، چاہے (اس راستے میں) شہادت ہی نصیب ہو جائے؛ یہ ہے امام حسینؑ کا راستہ اور امام عالی مقامؑ

کا قیام بھی اسی راستے میں تھا تاکہ بتائیں کہ (اِس وقت) وظیفہ کیا ہے۔

مکہ سے کوفہ روانگی اور راستے میں حرّ کا حائل ہو جانا

آٹھویں ذی الحجہ کے دن، جس دن تمام حاجی (احرام باندھ کر) مکہ کی طرف آتے ہیں تاکہ میدانِ عرفات کی طرف جائیں اور اپنے حج کے اعمال اور مناسکِ حج کا آغاز کریں، امام حسین علیہ السلام اس دن (اپنا حج کا احرام کھول کر) مکہ سے باہر نکل آتے ہیں اور جانبِ کوفہ روانہ ہو جاتے ہیں۔ البتہ اس قیام کے لیے خود اس دن کے انتخاب سے امام حسین علیہ السلام تمام لوگوں کو اپنے اِس کام اور اِس قیام کی حقیقت اور اہمیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے تاکہ سب لوگ آگاہ ہو جائیں کہ حسین ابن علی علیہما السلام نے یہ عظیم کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ پھر راستے کی ہر ہر منزل پر جو حوادث و واقعات پیش آئے ہیں، ان کی تفصیلات بہت زیادہ ہیں، جنہیں میں اس وقت بیان نہیں کر سکتا۔

یہاں تک کہ امام حسین علیہ السلام اُس منزل پر پہنچ گئے جہاں حرّ ابن یزید ریاحی نے آپؑ کے لشکر کا راستہ روک لیا۔ میں امام حسین علیہ السلام کی اِس تحریک اور قیام کے اُن مقاصد کو -جو خود حضرتؑ کے کلام میں بیان ہوئے ہیں- امام عالی مقام علیہ السلام کے بعض کلمات کی روشنی میں بیان کرتا ہوں تاکہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہ اقدام اور یہ قیام، درحقیقت کس مقصد اور کس ہدف کے لیے انجام پایا ہے۔ -اب جیسا کہ مشہور ہے اور آپ لوگ جانتے بھی ہیں کہ- حرّ ابن یزید ریاحی اپنے لشکر کے ساتھ (جنگ کے لیے نہیں بلکہ) امام حسین علیہ السلام کا راستہ روکنے کے لیے آیا تھا،کیونکہ امام عالی

مقامؑ کوفہ کی جانب جا رہے تھے؛ یعنی عبید اللہ ابن زیاد کا خیال تھا کہ اگر حسین ابن علی علیہما السلام کوفہ پہنچ گئے، تو ممکن ہے کہ آپؑ کی کوفہ میں موجودگی، لوگوں کو (اس کی حکومت کے خلاف) برانگیختہ کر دے اور شجاع بنا دے اور ایک بڑی فوج اور لشکر امام حسینؑ کے ارد گرد جمع ہو جائے؛ شاید اسی طرح ہو بھی جاتا؛ یعنی اگر امام عالی مقامؑ کوفہ میں داخل ہو جاتے، تو آپؑ کا کوفہ میں آنا کچھ لوگوں کو گزشتہ واقعات کی یاد دلاتا۔ کوفہ وہی شہر تھا، جہاں امامؑ کے پدرِ بزرگوار امیر المومنین علیؑ حکومت کرتے تھے، یہ وہی شہر تھا جہاں امام حسینؑ نے سالوں زندگی گزاری تھی اور لوگوں نے آپؑ کو اپنے بابا کے ساتھ، جو خلیفۃ المسلمین تھے، دیکھا بھی تھا اور لوگ آپؑ کو پہچانتے بھی تھے۔ ابھی کوئی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ اگرچہ اُس وقت کو تقریباً بیس (۲۰) سال کا عرصہ گزر گیا تھا؛ لیکن بیس (۲۰) سال کوئی زیادہ عرصہ نہیں ہوتا۔ اُس وقت کی یادیں ابھی باقی تھیں، امام حسینؑ کوفہ کو اچھی طرح جانتے تھے، کوفہ کے محلّوں، ان میں رہنے والے قبیلوں اور ان قبیلوں کے سرداروں، سب کو جانتے تھے اور یہ چیز حاکم اور والی کوفہ کے لیے ایک (بہت بڑا) خطرہ تھی کہ امام عالی مقامؑ کوفہ پہنچ جائیں۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ امام حسینؑ ہرگز کوفہ میں داخل نہ ہو سکیں اور راستے ہی میں ان کو (کوفہ آنے سے) روک دیا جائے۔

البتہ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ امام حسینؑ واپس لوٹ جائیں؛ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر آپؑ مکہ کی طرف واپس لوٹ گئے، تو پھر بھی ممکن ہے کہ آپؑ اُن کے لیے مشکلات کھڑی کریں۔ وہ چاہتے تھے اب جبکہ (ان کا مخالف اور) دشمن ان کے جال میں پھنس چکا ہے اور ان کے قبضے میں ہے، تو اس کا یہیں پر کام تمام کر دیں، چاہے اس کے پاس جو بھی

قدرت و طاقت اور وسائل ہوں؛ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے امام حسین علیہ السلام کے مقابلے میں حرّ ابن یزید ریاحی کو ایک ہزار سواروں کے لشکر کے ساتھ بھیجا تھا۔ اُس نے امامؑ کا راستہ روکا اور کہا: میں آپؑ کو کوفہ جانے نہیں دوں گا، امام عالی مقام علیہ السلام نے کافی اصرار اور کوشش کی، لیکن وہ نہیں مانا؛ یعنی وہ اس لیے نہیں آیا تھا کہ امامؑ کی بات قبول کرے اور اس نے قبول بھی نہیں کی۔ امام عالی مقام علیہ السلام نے فرمایا: اچھا تو پھر میں واپس لوٹ جاتا ہوں، لیکن اُس نے اسے بھی قبول نہیں کیا کہ آپؑ واپس لوٹ جائیں۔

پہلی منزل -جو ظاہراً منزل ''شراف'' تھی- جس پر آپؑ کا حرّ ابن یزید سے آمنا سامنا ہوا تھا، وہاں پر امامؑ نے کچھ جملے ارشاد فرمائے اور انہیں یاد دہانی کروائی؛ کیونکہ وہ لوگ جو (حرّ کے ساتھ) امام حسین علیہ السلام کے ساتھ جنگ کرنے آئے تھے، کوفہ اور عراق کے لوگ تھے۔ امام عالی مقام علیہ السلام نے انہیں یاد دلایا کہ تم ہی لوگوں نے مجھے دعوت دی تھی اور اپنی آمادگی (اور مدد و نُصرت) کا یقین دلایا تھا کہ میں کوفہ آ جاؤں اور وہاں الٰہی اور اسلامی حکومت تشکیل دوں اور اسلام کو زندہ کروں اور ہم آپؑ کی مدد و نُصرت کریں گے؛ اب تم لوگ کیوں (اپنے وعدوں اور قول و قرار سے) پِھر رہے ہو؟

دوسری منزل پر بھی امام عالی مقام علیہ السلام نے کچھ دیر گفتگو فرمائی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں امام حسین علیہ السلام نے اپنے پُر ہیجان اور جذبات برانگیز خطبوں میں سے ایک خطبہ -جس کے چند جملے میں عرض کرتا ہوں- بیان فرمایا ہے۔ آپؑ نے اپنے اصحاب کی طرف رُخ کیا؛ البتہ وہ کوفی (اور عراقی) لوگ بھی سُن رہے تھے۔ آپؑ مقدّمہ کے طور پر پروردگارِ عالم کی حمد و ثناء (اور تعریف و توصیف) کرنے کے بعد فرماتے ہیں: «إِنَّهُ قَدْ نَزَلَ مِنَ الْأَمْرِ مَا

قَدْ تَرَوْنَ»[1] یہ صورتِ حال جس کا تم مشاہدہ کر رہے ہو، ہمارے لیے پیش آ چکی ہے، «وَأَنَّ الدُّنْیا تَغَیَّرَتْ وَتَنَکَّرَتْ أَدْبَرَ مَعْرُوْفُهَا» دنیا اور زندگی کی زیبائی اور خوبصورتی باقی نہیں رہی، سب کچھ ختم ہو گیا ہے اور دنیا کی صورتِ حال بدل چکی ہے۔ یہ گفتگو ایسی ہستی کی گفتگو ہے جو یہ احساس کرتی ہے کہ اب اس کی زندگی سے زیادہ وقت باقی نہیں رہا ہے۔ «وَلَمْ یَبْقَ مِنْهَا إِلَّا صَبَابَةٌ کَصَبَابَةِ الْإِنَاءِ» دنیا سے اب کچھ باقی نہیں بچا، سوائے برتن کی تہہ میں رہ جانے والے چند قطروں کے۔ پھر چند جملے بیان کرنے کے بعد، فرماتے ہیں: «أَلَا تَرَوْنَ إِلَی الْحَقِّ لَا یُعْمَلُ بِهِ» کیا تم لوگ نہیں دیکھ رہے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا ہے؟ «وَإِلَی الْبَاطِلِ لَا یُتَنَاهَی عَنْهُ» اور باطل سے اجتناب نہیں برتا جا رہا ہے؟ یہ امام حسین علیہ السلام کے مقصد اور نقطۂ نظر کا خلاصہ ہے؛ یعنی تم لوگ دیکھ رہے ہو کہ اسلامی معاشرہ اپنی اس صحیح اور حقیقی حالت سے دور چلا گیا ہے؟ تم دیکھ رہے ہو کہ اب حق، عمل کے قابل نہیں رہا، لیکن باطل عمل کے قابل ہے! اب ایسی صورتِ حال میں کیا کرنا چاہیے؟ جب انسان یہ دیکھ رہا ہو کہ حق تو عمل کے قابل نہیں ہے لیکن (اس کے برعکس) باطل عمل کے قابل ہے، جب انسان ظلم و جور اور شقاوت و بدبختی سے پُر دنیا کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہو کہ حق تو عمل کے قابل نہیں اور باطل قابلِ عمل بھی ہے (اور اس پر عمل بھی ہو رہا ہے)، تو انسان ایسی صورتِ حال میں کیا کرے؟ «لِیَرْغَبِ الْمُؤْمِنُ فِی لِقَاءِ رَبِّهِ حَقّاً حَقّاً» مومن کو حق ہے کہ وہ پروردگارِ عالم کی ملاقات میں جلدی کرے۔ «فَإِنِّی لَا أَرَی الْمَوْتَ إِلَّا سَعَادَةً» میں اس (شہادت اور راہِ حق میں)

۱۔ بحار الانوار، تتمہ کتاب "تاریخ فاطمہ و الحسن و الحسین علیہم السلام"، باب۳۷؛ (اس خطبے کے مقام کے بارے میں مؤرّخین میں اختلافِ نظر پایا جاتا ہے۔)۔

موت کو سعادت و خوشبختی کے سوا کچھ نہیں سمجھتا، «وَالْحَيَاةَ مَعَ الظَّالِمِيْنَ إِلَّا بَرَماً» اور ظالموں اور ستمگروں کے ساتھ اور اُن کے سائے میں زندگی گزارنے کو سوائے رنج و غم اور بدبختی و ناراحتی کے کچھ نہیں سمجھتا؛ یہ وہی آمادگی اور تیاری ہے۔ یعنی اس کے بعد جب امام عالی مقام علیہ السلام نے قیام فرمایا (اور اپنی مزاحمتی تحریک کا آغاز کر دیا) تو خط لکھے، اپنے خروج اور قیام کا اعلان کر دیا اور جناب مسلم ابن عقیل[1] کے ذریعے کوفیوں کو بتا دیا کہ ہم نے قیام کر دیا ہے اور آگئے ہیں لہٰذا اب جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ لیکن (یہاں پہنچ کر) امام عالی مقام علیہ السلام دیکھتے ہیں کہ آپؑ کے اور آپؑ کے لشکر کے کوفہ کی جانب جانے کے راستے میں رکاوٹ ڈال دی گئی ہے اور اب وہ دوسرا نتیجہ انجام پائے گا۔ پہلا نتیجہ کیا تھا؟ حکومت کی باگ ڈور سنبھال لینا؛ دوسرا نتیجہ شہادت تھا؛ اِن دونوں میں سے کوئی ایک نتیجہ بہرحال پیش آنا ہی تھا۔ اس موقع پر امام حسین علیہ السلام محسوس کرتے ہیں کہ پہلا نتیجہ جو کہ حکومت کا حصول تھا، وہ اب انجام نہیں پا سکتا۔ جو چیز اب واقع ہو گی، وہ شہادت اور اس راہ میں خداوند متعال سے ملاقات سے عبارت ہے۔ اس

۱ ۔ معتبر تاریخی کتابوں کی تحقیق اور جانچ پڑتال کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ شخص جو یہاں پر امام عالی مقام علیہ السلام کا خط کوفہ لے کر جاتا ہے، وہ "قیس ابن مُسہّر" ہے۔ جناب مسلم ابن عقیلؑ اس سے پہلے کوفہ والوں سے بیعت کے لیے امامؑ کا خط لے کر جاتے ہیں اور وہاں سے (بیعت لینے کے بعد) امام عالی مقام علیہ السلام کو خط بھیجتے ہیں کہ کوفہ والے (آپؑ کی مدد و نُصرت کے لیے) تیار ہیں۔ اس کے بعد امامؑ کوفہ جاتے ہوئے راستے سے، ایک اور خط قیس ابن مُسہّر کے ذریعے روانہ کرتے ہیں، تاکہ اہل کوفہ کو اپنے کوفہ آنے کی خبر دیں۔ جبکہ اس وقت تک جناب مسلم ابن عقیلؑ کوفہ میں شہید کر دیئے گئے تھے اور جناب قیس بھی کوفہ میں داخل ہونے کے بعد، ابن زیاد کے ہاتھوں شہید ہو جاتے ہیں۔ امام حسین علیہ السلام جناب قیس کی شہادت کی خبر سننے کے بعد، سورۂ احزاب کی تئیسویں (۲۳) آیت کی تلاوت فرماتے ہیں: «مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُم مَّن قَضَى نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا»۔

لیے آپؑ اپنی آمادگی اور تیاری کا علان فرماتے ہیں کہ اب ایسی صورتِ حال پیدا ہو چکی ہے کہ اس حالت میں، ایک مومن کو پروردگارِ عالم سے ملاقات کی آرزو کرنی چاہیے۔

جب انسان یہ دیکھ رہا ہوا کہ ایک عالم ظلم و جور، اس کے سامنے ہے، جب انسان دیکھ رہا ہو کہ ظالم و ستمگر قسم کے افراد سارے عالم کے اُمور کی باگ ڈور سنبھالے اُن پر مسلّط ہیں، تو انسان کو اپنی پوری تیاری کے ساتھ، اس صورتِ حال کے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑے ہونا چاہیے اور اس قسم کی صورتِ حال اور کیفیت میں اس کے لیے شہادت ایک شیرین اور گوارا ترین چیز ہے؛ یہ امام عالی مقامؑ کے کلمات میں سے ایک ہے۔

امام عالی مقامؑ کے مذکورہ کلمات سننے کے باوجود، حرّ ابن یزید اپنا محاصرہ اور دباؤ برقرار رکھتا ہے اور اجازت نہیں دیتا کہ امامؑ کوفہ کی جانب روانہ ہو سکیں یا واپس (مکہ یا مدینہ کی طرف) لوٹ جائیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ امام عالی مقامؑ ایک تیسرا درمیانی راستہ انتخاب کرتے ہیں اور اس پر روانہ ہو جاتے ہیں، حرّ ابن یزید بھی (اپنے لشکر کے ساتھ) آپؑ کے ہمراہ آنے لگتا ہے؛ یعنی گویا اسے یہی کہا گیا تھا کہ امام حسینؑ نہ تو کوفہ کی طرف آگے بڑھیں اور نہ واپس لوٹ کر جائیں اور «اَلْمَامُورُ مَعْذُورٌ»[1] کے مصداق حرّ بھی ان دونوں احکامات پر عمل کرنے کا پابند تھا؛ لیکن جب امام حسینؑ نے تیسرے درمیانی راستے کا انتخاب کیا اور اس راستے پر روانہ ہو گئے، تو حرّ کو معلوم نہیں تھا کہ اب کیا کرنا ہے، کیونکہ اس بارے میں اسے کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سوچا کہ اب اس کا وظیفہ

۱- یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو حکومتی کارندوں اور گماشتوں کے لیے استعمال ہوتی ہے، تاکہ وہ کہہ سکیں: ہم تو مجبور ہیں ہمیں تو اسی طرح حکم دیا گیا ہے۔

یہ ہے کہ جہاں بھی امام عالی مقام علیہ السلام جائیں، یہ بھی آپؑ کے ہمراہ اور آپؑ کے پیچھے پیچھے وہیں چلا جائے۔ اس لیے وہ ہر ہر منزل پر امامؑ کے ساتھ رہا، یہاں تک کہ کربلا پہنچ گئے۔

کربلا پہنچنے سے پہلے ایک اور منزل پر امام حسین علیہ السلام نے ایک اور خطاب ارشاد فرمایا، اگرچہ یہ خطاب بہت زیادہ تفصیلی نہیں ہے، لیکن دندان شکن، منہ توڑ اور بہت زیادہ قوی و مضبوط ہے۔ اس خطاب میں آپؑ وہی مطالب بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِس قسم کی صورتِ حال کے بارے میں دستور العمل بیان فرمایا تھا، لیکن اس پر عمل کرنا ہمارے اُوپر اور بعد میں آنے والے لوگوں پر چھوڑ دیا تھا۔

دوسری یا تیسری منزل جو "بیضہ" کے نام سے موسوم ہے، اس مقام پر امام عالی مقام علیہ السلام نے ایک اور خطاب ارشاد فرمایا۔ اس خطاب میں اس انداز سے فرماتے ہیں: «بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ. أَيُّهَا النّاسُ، اِنَّ رَسُولَ اللهِ (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ) قَدْ قَالَ فِي حَيَاتِهِ: «مَنْ رَأَى سُلْطَاناً جَائِراً مُسْتَحِلاً لِحُرُمِ اللهِ، نَاكِثاً لِعَهْدِ اللهِ، مُخالِفاً لِسُنَّةِ رَسُولِ اللهِ، يَعْمَلُ فِي عِبَادِ اللهِ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوانِ ثُمَّ لَمْ يُغَيِّرْ عَلَيْهِ بِفِعْل وَلَا قَوْل، كَانَ حَقّاً عَلَى اللهِ أَنْ يُدْخِلَهُ مَدْخَلَهُ»[1] یعنی اے لوگو! اب امامؑ کے مخاطبین تو (زیادہ تر) اپنے ہی لوگ تھے، جو آپؑ کی منطق اور فکر سے بخوبی واقف تھے اور یہ باتیں اُن کے علم میں تھیں، لیکن پھر بھی اُن کے اذہان میں راسخ تر کرنے کے لیے امام حسین ابن علی علیہما السلام یہ گفتگو فرما رہے تھے اور حرّ ابن یزید کے لشکر والے بھی تھے، جن کے کانوں تک یہ باتیں بہت کم پہنچی تھیں اور

۱۔ وقعۃ الطف، خروج الحسین علیہ السلام من مکہ، منازل الطریق، منزل البیضہ۔

وہ اچھی طرح سے نہیں جانتے تھے کہ حسین ابن علی علیہما السلام کس لیے آئے ہیں؟ (اور آپؑ کا مقصد کیا ہے؟) اس لیے کہ امام حسین علیہ السلام کے خلاف پروپیگنڈہ بہت زیادہ تھا۔

«اَیُّهَا النّاسُ» اے لوگو! یعنی اے وہ لوگو جو میرے ساتھ ہو اور یہ جاننا چاہتے ہو کہ ہمارے اِس قیام کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ اور اے وہ لوگو جو آج ہمارے دشمن کے طور پر ہمارے مدِّمقابل قرار پائے ہو؛ اور اے غافل و لاپروا لوگو کہ تم تک قیامِ حسینؑ کی خبر پہنچے گی اور تم نہیں جانتے ہوں گے کہ فرزندِ پیغمبرؐ نے کیوں قیام کیا؟ اور اے وہ لوگو! جو طولِ تاریخ میں احکامِ اسلام اور احکام و شرائع الٰہی جاننے کے درپے تو ہوں گے، لیکن یہ نہیں جانتے ہوں گے کہ ہم نے کیوں قیام کیا؛ تو (تم سب) جان لو: «اَیُّهَا النّاسُ؛ اِنَّ رَسُولَ اللهِ (صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَآلِهِ) قَدْ قَالَ فِی حَیَاتِهِ: «مَنْ رَأَی سُلْطَاناً جَائِراً مُسْتَحِلاً لِحُرُمِ اللهِ، نَاکِثاً لِعَهْدِ اللهِ، مُخالِفاً لِسُنَّةِ رَسُولِ اللهِ، یَعْمَلُ فِی عِبَادِ اللهِ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوانِ ثُمَّ لَمْ یُغَیِّرْ عَلَیْهِ بِفِعْل وَلَا قَوْل، کَانَ حَقّاً عَلَی اللهِ أَنْ یُدْخِلَهُ مَدْخَلَهُ» یہ پیغمبر خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے؛ یعنی اے لوگو! میں یہ باتیں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ میری ذاتی نظر اور شخصی سلیقہ و پسند نہیں ہے جو میں بیان کر رہا ہوں۔ یہ وہی حکمت آموز باتیں ہیں جو پیغمبر اکرمصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں اور میں ان پر عمل کروں گا۔

پیغمبر خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص دیکھے کہ معاشرے پر ایسا (ظالم و جابر) حکمران اور سلطان حاکم ہے جو حرامِ خدا کو حلال اور حلالِ خدا کو حرام قرار دے رہا ہے، عہد و پیمانِ الٰہی کو توڑ رہا ہے، (سنتِ رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت پر کمر بستہ ہے)، بندگانِ خدا کے درمیان ظلم و جور، (گناہ و معصیت)

اور دشمنی و کینہ توزی کے ساتھ عمل کر رہا ہے؛ **یعنی لوگوں کی محبت اور اُن سے عشق و علاقہ، اُس کے دل میں موجود نہیں ہے اور لوگوں کے منافع و مصالح اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، بلکہ اُس کے لیے صرف اپنے منافع و مفادات ہی اہم ہیں،** تو جو شخص اِس صورتِ حال کا مشاہدہ کرے اور اس وضعیت و صورتِ حال کے مقابلے میں، اپنے عمل اور اپنی زبان سے کوئی اقدام نہ کرے، «كَانَ حَقّاً عَلَى اللهِ أَنْ يُدْخِلَهُ مَدْخَلَهُ» یعنی خدا وند متعال پر لازم اور فرض ہے کہ وہ ایسے لاپرواہ اور غافل شخص کو بھی روزِ قیامت، اسی جگہ لے جائے جہاں اس ظالم و جابر حکمران کو لے جائے گا اور اس کی ظلم و ستم اور فساد و انحراف کے مقابلے میں لاپرواہی اور بےتوجہی کی وجہ سے؛ اسے بھی اسی کے عذاب میں مبتلا کرے۔ جو لوگ لاپرواہی اور بےتوجہی کا شکار ہیں، حقیقت میں وہ لوگ اپنی طاقت (اور صلاحیتوں) کو پروردگارِ عالم اور قدرتِ الٰہی کی دسترس میں قرار نہیں دیتے اور ایسی مزاحمتی تحریک اور قیام سے، جو حق کو (برملا کرتے ہوئے) اقتدار کو کرسی پر بٹھانے اور احکامِ الٰہی کو نافذ کرنے کے لیے برپا کیا گیا ہے، اس کی دسترس سے اپنی قدرت و طاقت اور صلاحیتوں کو دور رکھتے ہیں؛ انہوں نے اپنی طاقت و قدرت کی ذخیرہ اندوزی کی ہے اور جس طاقت و قدرت کو راہِ خدا وند متعال میں صَرف ہونا چاہیے تھا، صَرف نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن کا حکم (اور ٹھکانہ) بھی وہی ہے، کیونکہ حقیقت میں یہی لوگ اُن ظالموں اور جابروں کی تائید کرنے والے ہیں۔

اسلامی ملکوں کی موجودہ صورتِ حال

آج اسلامی ملکوں میں، جہاں ظالم و جابر اور فاسق و فاجر حکمران موجود ہیں، جو خدا کے حرام کردہ کو حلال کرنے والے ہیں، انہوں نے خدا کے عہد و پیمان کو توڑ دیا ہے اور امریکہ (اور دوسری استعماری طاقتوں) کے ساتھ عہد و پیمان باندھ لیا ہے اور جب انسان خدا کے عہد و پیمان کو توڑ دیتا ہے تو شیطان سے عہد و پیمان باندھ لیتا ہے، شیطان کا عہد و پیمان، خدا کے عہد و پیمان کی جگہ لے لیتا ہے۔ آج شیطانِ بزرگ کہلانے کا مصداق " امریکہ" ہے۔ ان ملکوں میں، جنہوں نے شیطانِ بزرگ سے عہد و پیمان باندھا ہے اور اپنی قوم و ملت کے تمام منافع اور ہر قسم کے امکانات، شیطانِ بزرگ کے اختیار میں دے دیئے ہیں، بجائے اس کے کہ ان منافع اور امکانات کو خدا وند بزرگ کے اختیار میں قرار دیتے؛ یہ بھی اسی کا مصداق ہیں۔ اِن ملکوں میں وہ لوگ جو لاپرواہ اور عدم توجہی کا شکار ہیں، اِس صورتِ حال اور زبوں حالی کا مشاہدہ کرتے ہیں، لیکن اس صورتِ حال کے بارے میں، اپنے لیے کسی وظیفے اور ذمہ داری کا احساس نہیں کرتے، انہوں نے درحقیقت کیا کام کیا ہے؟ انہوں نے اس قوت و طاقت کو جو خدا کے لیے ہے، اس طاقتِ الٰہی اور استعداد الٰہی کو اپنے اختیار سے خارج کر دیا ہے، کیا ایسا نہیں ہے؟ یہ اسی کی مانند ہے کہ آپ کے پاس بہت زیادہ پیسے ہوں اور کوئی بھوکا شخص بھی وہاں پر بھوک سے مر رہا ہو؛ تو آپ نے اپنے پیسوں اور اپنے مالی سرمائے کی ذخیرہ اندوزی کی ہے اور جہاں اسے خرچ کرنا چاہیے تھا تاکہ کسی انسان کی جان بچائی جا سکے، وہاں آپ نے اسے خرچ نہیں کیا ہے؛ یا کسی قوم کو پیسوں (اور مالی امداد) کی ضرورت ہو، جبکہ آپ پیسوں کی یا ضرورت کی اشیاء کی ذخیرہ اندوزی کریں اور اس کو ضرورتمندوں تک، ایک قوم تک،

ایک خاص قسم کے نیازمندوں تک نہ پہنچائیں، تو حقیقت میں آپ گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اسی طرح اگر انسان اِن اسلامی ملکوں میں موجود فساد اور خلاف کاریوں (اور ظلم و ستم) کے سامنے لاپرواہی اور بےتوجہی برتتا ہے، تو یہ حقیقت میں کیا ہے؟ یہ بھی حقیقت میں اپنی معنوی و درونی طاقت اور صلاحیتوں کی ذخیرہ اندوزی کرنا اور خدمتِ خدا وند متعال میں قرار نہ دینا ہے؛ درحقیقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیان یہ ہے۔

پس امام حسین ابن علی علیہما السلام کا قیام بھی اسی خاطر ہے کہ وہ فساد اور ظلم و ستم جو (معاشرے میں) موجود ہے، اس کے مقابلے میں اپنی طاقت اور قدرت کو استعمال کریں اور انسانوں کو یہ سکھائیں اور آئندہ تاریخ کو یہ تعلیم دیں کہ اگر چنانچہ تمہارے معاشرے میں بھی اِس قسم کی صورتِ حال پیش آئے تو تمہیں بھی چاہیے کہ اسی طرح عمل کرو۔

جس وقت یہاں گھٹن اور سخت پابندیوں کا ماحول تھا اور انسان آزادی سے واضح طور پر کوئی بات نہیں کر سکتا تھا اور اس وقت ایران میں بھی فاسق و فاجر حکمران کی حکومت تھی، تو اس وقت بہت سے اس کے مقابلے میں لاپرواہی اور بےتوجہی و بےحسی کا شکار تھے؛ تو اُس دور میں ہم ان مطالب اور ان باتوں کو مثالوں کے ضمن میں بیان کیا کرتے تھے؛ مثلاً ایک ایسے تاجر کی مثال دیتے تھے جو تجارت اور معاملات طے کرنے کے لیے ہندوستان جا رہا تھا۔ جب وہ تاجر اپنے اس سفر پر روانہ ہو رہا تھا تو اس کے گھر میں ایک طوطا تھا، تاجر نے اس طوطے سے کہا: میں سفر پر تمہارے ملک (ہندوستان) جا رہا ہوں، کیا تمہارا کوئی پیغام، کوئی کام یا کوئی خواہش وغیرہ ہے؟ طوطے نے تاجر سے کہا: ہاں کیوں نہیں! میری خواہش یہ ہے

کہ جب تم ہندوستان جاؤ تو وہاں کے فلاں مقام پر جانا،کیونکہ وہ میرے رشتہ داروں اور ہم قبیلہ طوطوں کا مسکن اور مقام ہے، وہاں تم اُن سے کہنا کہ میں جو اُن کے خاندان کا حصّہ اور ان کی نوع سے تعلق رکھتا ہوں، یہاں (ایران میں) تمہارے گھر پر پنجرے میں قید ہوں۔ صرف میری یہ خبر اُن تک پہنچا دو، مجھے تم سے کوئی اور کام نہیں ہے۔

تاجر ہندوستان سفر پر روانہ ہو گیا، وہاں اس نے اپنے تجارتی معاملات انجام دیئے، جو تحفے تحائف اور سوغات اپنے بیوی بچوں، رشتہ داروں، دوستوں اور ہمسائیوں کے لیے لینا چاہتا تھا، وہ لیں اور آخر میں طوطے کے بتائے ہوئے مقام کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ بالآخر وہ اس مقام پر پہنچا اور دیکھا کہ وہاں طوطوں کا ایک بہت بڑا جُھنڈ ہے، ہزاروں کی تعداد میں طوطے درختوں کی شاخوں پر بیٹھے ٹائیں ٹائیں کر رہے ہیں۔ وہ وہاں (درختوں کے درمیان میں) پہنچا اور طوطوں سے کہا: میرے پاس تمہارے لیے ایک پیغام ہے، طوطوں نے پوچھا: وہ پیغام کیا ہے؟ اور سب طوطے خاموش اور ہمہ تن گوش ہو گئے۔ تاجر نے کہا: میرا پیغام یہ ہے کہ تم میں سے ایک طوطا، ایران کے فلاں شہر میں، میرے گھر پر پنجرے میں قید ہے۔ جیسے ہی تاجر نے یہ کہا، اُس نے دیکھا کہ اچانک سب طوطے درختوں پر پھڑ پھڑانے لگے اور زمین پر گر کر تڑپنے لگے اور سب کے سب مر گئے۔ تاجر کو بہت افسوس اور دکھ ہوا، (دل ہی دل میں) کہنے لگا: ہائے افسوس! میں نے اتنے سارے طوطوں کو ایک بُری خبر سے اس قدر ناراحت و غمگین کیا کہ وہ سب کے سب گر کر مر گئے۔

تاجر اسی غم و اندوہ کے ساتھ اپنے شہر واپس آیا، تحفے تحائف اور سوغات سب تقسیم کیں، اس کے بعد پنجرے میں قید اپنے طوطے کے پاس آیا اور کہا: تم نے بھی مجھ سے عجیب و غریب پیغام بھجوایا تھا، (طوطے نے حیرت سے) پوچھا: مگر ایسا کیا ہو گیا؟ تاجر نے کہا: میں وہاں گیا اور جیسے ہی میں نے تمہارا وہ پیغام، تمہاری قوم کے طوطوں اور تمہارے رشتہ داروں کو پہنچایا، ایک دم وہ سب کے سب اپنے پر پھڑ پھڑانے لگے اور درختوں کی شاخوں سے زمین پر گرے اور مر گئے۔ جیسے ہی تاجر نے یہ بات کہی، ایک دم تاجر کا طوطا بھی، جو پنجرے میں ایک تار پر بیٹھا ہوا تھا، پھڑ پھڑانے لگا اور وہ بھی پنجرے میں گر کر مر گیا۔ تاجر نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا: یہ کس قدر منحوس پیغام ہے؛ اُن طوطوں کو دیا تو وہ مر گئے اور اپنے اِس طوطے کو دیا تو یہ مر گیا۔ اُس نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور طوطے کی ٹانگ پکڑ کر باہر نکالا اور چھت کی طرف اُچھال دیا۔ جیسے ہی طوطا پنجرے کی قید سے، آزاد فضاء میں پہنچا، اُس نے ہوا میں اُڑنا شروع کر دیا اور زندہ ہو گیا۔ پھر دیوار پر جا کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: اے میرے عزیز تاجر مالک! شکریہ کہ تم نے ایک دو سال مجھے غذا فراہم کی، میں نے زحمت میں ڈالا، مجھے معاف کر دینا۔ اب میں اپنی قوم و قبیلہ والوں اور اپنے رشتہ داروں کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ بھی نہیں مرے ہیں، بلکہ وہ بھی میری طرح زندہ و سلامت ہیں۔ انہوں نے مجھے تمہارے ذریعے سکھایا کہ میری آزادی کا واحد راستہ یہی ہے کہ میں بھی اپنے پروں کو پھڑ پھڑاؤں اور زمین پر گر جاؤں۔ انہوں نے مجھے عملی طور پر پھڑ پھڑانے اور مرنے کے ڈرامہ کرنے کا طریقہ سکھایا اور میں نے بھی اُن سے اس چیز کو سیکھ لیا اور اس پر عمل کرکے اس وقت تمہاری قید سے آزاد ہو چکا ہوں۔ اب تک

تمہارے پنجرے میں قید تھا، لیکن (اس ترکیب اور حیلے کے ذریعے تمہاری قید سے) اب آزاد ہو گیا ہوں۔

ہم اُس گھٹن زدہ اور تنگ و تاریک دور میں، جب تقاریر کرتے تھے تو اپنے دوستوں اور جان پہچان والوں کے لیے اس قسم کی مثالیں بیان کیا کرتے تھے، تاکہ وہ جان لیں کہ کبھی تاریخ کی ایک تحریک و قیام اور تاریخ کا ایک عمل، ایک مکمل درس ہوتا ہے، ایک نمونۂ عمل اور اُسوہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے خود اس عمل اور قیام کی، اُس زمانے میں بھی عظیم تاثیر رہی ہو؛ لیکن وہ تحریک اور قیام، آئندہ تاریخ میں اپنا جو اثر چھوڑتا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

امام حسین علیہ السلام کا قیام بھی اسی قسم کا ہے۔ حسین ابن علی علیہما السلام نے اسلامی معاشرے کی اُس وقت کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال میں، جو ہر روز بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی، اپنی مزاحمتی تحریک اور اپنے قیام سے اُس زمانے میں بھی اثر مرتّب کیا اور اس زمانے میں بھی لوگوں کی فریاد بلند ہونے لگی۔ اسی زمانے میں بہت سے لوگوں پر یزید کے کاموں کی حقیقت عیاں ہونے لگی۔ وہی کوفہ کے لوگ، وہی شام کے لوگ کسی حدّ تک یزید کو پہچاننے لگے اور یزید کے چہرے سے پردے ہٹنے لگے۔ یہ ایک عظیم کام تھا؛ لیکن جو تاثیر خود اس زمانے میں امام حسین علیہ السلام کے قیام سے حاصل ہوئی، اس سے بھی عظیم تر اور قوی تر تاثیر وہ ہے کہ جو تاریخ میں باقی رہ گئی ہے۔ تمام عالم کے مسلمانوں کو معلوم ہو گیا ہے جب اسلامی معاشرے اور اسلامی نظام کی یہ ریل گاڑی اپنی پٹری سے اُتر جائے، تو اس کا علاج وہی کام اور وہی عمل ہے جو امام حسین علیہ السلام نے انجام دیا۔ جب عالمِ اسلام کو فساد (اور ظلم و ستم)

گھیر لے، تو علاج وہی کام ہے جو حضرت امام حسین علیہ السلام نے کیا۔

اسلامی انقلاب، قیامِ امام حسین علیہ السلام کا پرتو

آپ لوگوں نے ملاحظہ کیا کہ ہمارے عزیز امامِ اُمت (قدس سرّہ) نے امام حسین علیہ السلام سے یہ درس بہت اچھی طرح سیکھا ہے۔ بعض لوگوں کی درس لینے کی صلاحیت اتنی قوی نہیں ہوتی، لیکن امامِ اُمت (قدس سرّہ) کی درس لینے کی یہ صلاحیت بہت قوی تھی۔ انہوں نے یہ درس لیا اور ہم تک منتقل کیا۔ ہمیں سکھایا کہ جب ہم دیکھیں کہ ظلم و جور، فساد و انحراف اور گھٹن زدہ ماحول، معاشرے کے مسئولین کی طرف پھیلایا جا رہا ہو اور حکومت و طاغوت -جو سب سے بالاترین منصب پر قابض ہے- کی طرف سے فتنہ و فساد اُبل رہا ہو، جب ہم اس صورتِ حال کا مشاہدہ کریں تو ضروری ہے کہ ہم بھی امام حسین علیہ السلام کی مانند کام اور قیام کریں۔ جب بھی ہمارے زمانے میں کوئی یزید پیدا ہو جائے، تو ضروری ہے کہ ہم بھی امام حسین علیہ السلام کے شاگرد بن جائیں اور امام حسین علیہ السلام والا کام انجام دیں۔ یہی وہ چیز تھی جسے امام حسین ابن علی علیہما السلام نے ہمیں سکھایا اور ہم نے خود اپنی زندگی میں اس پر عمل کیا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ یعنی ہماری قوم نے یہ کام کر دکھایا ہے، ہماری قوم نے ایک حسینیؑ (اور الٰہی) کام کیا ہے۔ پوری قوم نے اپنے زمانے کے حسین، یعنی ہمارے عزیز اور بزرگوار امامِ اُمت (قدس سرّہ) کے پیچھے اور اُن کے نقشِ قدم پر حرکت کی، خود ہمارے امامِ اُمت (قدس سرّہ) نے بھی قیام کیا اور قوم نے بھی اُن کا (پورا پورا) ساتھ دیا اور وہ ایسا کارنامہ انجام دینے میں کامیاب ہو گئے جو صدیوں سے مومن و مخلص مسلمانوں کی

فاسد نظاموں کے مقابلے میں آرزو اور تمنّا تھی۔ الحمد للہ آج اسلامی نظام کی شکل میں یہ دیرینہ آرزو پوری ہو چکی ہے اور ایک اسلامی معاشرہ وجود میں آ چکا ہے۔ البتہ اِس نظام کو مکمل اسلامی نظام کی طرف بڑھنا چاہیے، جو کہ ان شاء اللہ اسی سمت جا رہا ہے۔ یہ تھا وہ بہت ہی عظیم ہدف و مقصد، جس کی وجہ سے امام حسین ابن علی علیہما السلام نے وہ عظیم فداکاریاں اور قربانیاں دیں اور وہ رنج و مصائب اور سختیاں برداشت کیں کہ جن کے سامنے بڑے بڑے دل، حقیر و ناتواں ہیں اور طاقتور و قوی ترین ارواح، ضعیف و کمزور ہیں۔

امام حسین علیہ السلام نے جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ امام حسین علیہ السلام کے بعد آج تک دنیا میں کسی نے بھی انجام نہیں دیا، میں نے پہلے بھی ایک دفعہ کہا ہے کہ شہادتیں اور شہید (ہمارے لیے) بہت عزیز و گرامی اور ارجمند ہیں، لیکن کوئی بھی شہادت، خود وجودِ مقدّس سید الشہداء علیہ السلام اور آپؑ کے اصحابِ باوفا کی شہادت (سے بڑھ کر) اور کوئی بھی دن روزِ عاشورا کی مانند، ابھی تک اس دنیا میں واقع نہیں ہوا ہے۔ وہ چیز جو اس دن رونما ہوئی، اُن شہداء کی غربت، اُن کی تنہائی، وہ سختیاں اور مصیبتیں جو اُن پر ڈھائی گئیں، یہ کہ وہ جانتے تھے کہ اِن بکھرے ہوئے شہداء کے لاشوں کا کوئی جمع کرنے والا بھی نہیں ہے۔ یہ شہادتیں، واقعاً ایسی شہادتیں ہیں کہ جن کی تاریخ میں کوئی مثال ہی نہیں ملتی اور یہ جو امام حسین علیہ السلام سید الشہداء اور تمام شہداء کے سرور و سردار ہیں، یہ بھی اسی وجہ سے ہے کہ (آپؑ کے علاوہ) کوئی اور اس طرح کی شہادت اور شہادت طلبی کا حامل نہیں ہے۔ البتہ حسین ابن علی علیہما السلام (عظمت کی) ایک بلند چوٹی پر کھڑے ہیں اور ہمیں چاہیے کہ ہم بھی چوٹی کے نیچے سے اُس بلندی کی طرف سفر کریں۔

یہ وہی ہدف و مقصد تھا جس نے ہمارے اِس انقلاب کو جنبش و حرکت دی اور ہم بھی اسی ہدف و مقصد کو لے کر آگے بڑھے۔ اُس گھٹن زدہ ماحول میں، جن لوگوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر مبارزہ آرائی کی، لوگوں کی ہدایت و راہنمائی کرنے کے جرم میں سختیاں اور مشکلات برداشت کیں، زندان گئے، قاتلانہ حملوں کی زد میں آئے اور بعض شہید کر دیئے گئے؛ اُن سب کا ہدف و مقصد یہی تھا۔ یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امام حسین ابن علی علیہما السلام سے منقول اُس روایت کے مطابق، جس میں آپؑ نے تمام مسلمانوں کو جرأت و بہادری کا مظاہرہ کرنے اور قیام کرنے کی ترغیب دلائی تھی، اُس نے ہمارے لوگوں کو بھی قیام پر وادار کیا اور اِس کام پر اُبھارا۔ آج بھی دنیا کے تمام مسلمانوں کا وظیفہ اور امام حسین ابن علی علیہما السلام کا اُن کے لیے پیغام یہی ہے۔ سب جگہ یہی مسئلہ ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر وہ اپنے اِس وظیفے کو انجام نہ دیں، تو خدا وند متعال کے یہاں اُس ظالم و جابر (حکمران) کی سرنوشت اور مصالح اسلامی اور اسلامی مفادات سے لاپرواہی اور بےاعتناہی برتنے والے اِس شخص کی سرنوشت ایک ہی ہو گی۔ البتہ آج دنیا بھر کے خون آشام اور خونخوار مستکبرین اور استعمار گروں کے مدِّمقابل ہمارا وظیفہ اور ذمہ داری بھی یہی ہے۔ ہم ابھی اپنی جدّ و جہد اور مبارزہ آرائی کو مکمل نہیں سمجھتے۔ ہم ابھی تک حسینی قیام اور تحریک کو اپنے اِس معاشرے میں ختم شدہ تصوّر نہیں کرتے۔ ہم اب بھی کربلا اور عاشورا کے راستے پر چل رہے ہیں۔ ہماری قوم کو اب بھی یہی احساس کرنا چاہیے کہ وہ نینوا اور کربلا کے میدان میں حاضر ہے۔ ایک دن آپ حسینیوں نے ساڑھے تیرہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد خیانت کار محمد رضا پہلوی کے سامنے قیام کیا (اور کامیاب ہوئے)، اب ایک اور دن آپ

حسینیوں اور عاشورا کے پیروکاروں کا سامنا، محمد رضا پہلوی کے ارباب اور اُس کے خداؤں -یعنی عالمی استکبار- سے ہے، اس میں کوئی فرق نہیں ہے؛ یہی مسلمانوں کے حقیقی قیام اور تحریک کی روح ہے۔ دنیا میں جہاں بھی اسلام کے دوبارہ احیاء کے لیے اور حدودِ الٰہی کے نفاذ کے لیے کوئی تحریک چل رہی ہے، وہ ایک حسینی تحریک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ جو فلسطین کی نجات اور آزادی کے لیے تحریک چلا رہے ہیں، وہ بھی امام حسین علیہ السلام کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ فلسطین کے بعض رہبروں ---- کے اپنے اظہارِ خیال، دعوؤں اور خوشی کا باعث یہی چیز تھی اور وہ اُس وقت صحیح بھی کہتے تھے کہ ہم کربلا اور عاشورا کی روح اور امام حسین علیہ السلام کے خط سے الہام لیتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ وہاں ایسا ہی تھا اور دنیا میں جہاں کوئی تحریک چل رہی ہے، وہ درحقیقت امام حسین علیہ السلام کے پیغام ہی کے نتیجے میں ہے اور امام حسین ابن علی علیہما السلام نے اس مضبوط اور قوی قوتِ ارادی کے ساتھ قیام فرمایا ہے۔

امام حسین علیہ السلام کا فاتحانہ اور جرأت مندانہ انداز

امام حسین علیہ السلام کے مدینہ تا مکہ سفر کے دوران، پھر مکہ میں چند ماہ قیام فرمانے کے بعد، مکہ سے کربلا تک کے طولانی (اور کٹھن) سفر کے دوران، جو آٹھ ذی الحجہ سے تقریباً دو محرم الحرام تک، یعنی تقریباً بیس (۲۰) یا بائیس (۲۲) دن جاری رہا، اس پورے راستے میں جو امام حسین علیہ السلام نے طے کیا، آپ کہیں بھی امام حسین علیہ السلام سے کسی قسم کے دفاعی اور شکست خوردہ شخص کے انداز کو ملاحظہ و مشاہدہ نہیں کریں گے۔ سب جگہ آپؑ کا انداز اور لب

و لہجہ ایک فاتح اور کامیاب شخص کا ہے۔ ہر ایک یہ سوال کرتا ہے کہ اگر کوئی آدمی ہے تو اس کی ظرفیت (اور قوتِ برداشت کی حدّ) بھی زیادہ نہیں ہے، کمزور ہے، یا فرزدق شاعر کی مانند ہے کہ اگرچہ اس کا دل، امام حسین علیہ السلام کے ساتھ ہے، لیکن جنگ کرنے اور اپنے لیے مشکلات کھڑی کرنے کا حوصلہ اور ہمت نہیں رکھتا؛ یا جناب اُم سلمہ کی مانند ہے کہ جو ایک نہایت ہی بوڑھی اور ضعیف خاتون ہیں، ان کے دل کو غمگین اور افسردہ خاطر بھی نہیں کرنا چاہیے؛ یا جناب محمد ابن حنفیہ کی مانند ہے کہ جب وہ دوسری دفعہ مکہ معظمہ میں امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو بیمار تھے -محمد ابن حنفیہ اگر بیمار نہ ہوتے تو شاید امام حسین علیہ السلام کا ساتھ دیتے- امام حسین علیہ السلام نے انہیں بھی ایک طرح سے جواب دے کر مطمئن کر دیا۔ اس قسم کے مواقع پر، امام حسین علیہ السلام اگر کوئی ایسا جواب دیتے ہیں، جس کی طرفِ مقابل میں سننے اور برداشت کرنے کی طاقت اور ہمت نہیں ہے، تو آپؑ انہیں مطمئن کرنے کے لیے مختصر سا جواب دیتے ہیں، جیسے: ''اب جو بھی خدا وند عالم کی رضا و خوشنودی ہو''؛ ''جو بھی پیش آیا''؛ ''ہم نے اپنے آپ کو ہر چیز کے لیے تیار کیا ہوا ہے''؛ ''ان شاء اللہ کچھ نہیں ہو گا'' اس طرح کے مختصر جواب آپؑ دیتے تھے اور محمد ابن حنفیہ کے جواب میں فرمایا: ''اب دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔''

لیکن وہ لوگ جن کے ساتھ قاطعانہ اور پُرصلابت گفتگو کرنی چاہیے، امام حسین علیہ السلام اُن کے ساتھ قاطعانہ، واضح اور دو ٹوک گفتگو فرماتے ہیں؛ جب ولید ابن عتبہ نے امام حسین علیہ السلام کو (بیعت لیے بغیر) ایسے ہی چھوڑ دیا، تو وہ یزید کے عتاب کا نشانہ بنا اور اسے گورنری کے عہدے سے معزول کر دیا گیا اور (اس کی جگہ) عمرو ابن سعید ابن عاص کو (مدینہ کا) گورنر بنا دیا گیا۔ یہ

شخص بھی حج کے بہانے مکہ آیا ہوا تھا۔ جب امام حسین علیہ السلام مکہ سے (کوفہ کے لیے) نکل رہے تھے، تو یہ شخص اتفاق سے مکہ ہی میں موجود تھا۔ عبد اللہ ابن جعفر، حضرت زینب علیہا السلام کے شوہر، نے گورنر کے بھائی کو اپنے ساتھ لیا اور جلد بازی و ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عمرو ابن سعید سے (امام حسین علیہ السلام کے لیے) امان نامہ حاصل کر لیا اور اپنے آپ کو تیزی سے مکہ سے باہر امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں پہنچایا اور عرض کیا: مولا! یہ (آپؑ کے لیے) امان نامہ ہے، مہربانی فرما کر آپؑ سفر پر روانہ نہ ہوں اور یہیں مکہ میں ٹھہر جائیں، دیکھتے ہیں اور کیا کچھ ہو سکتا ہے؟ یہاں پر امام عالی مقام علیہ السلام واضح، محکم اور دو ٹوک گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''(درحقیقت) امان، تو خدا کی امان ہے، جس شخص کو خدا کی طرف سے امان حاصل ہو، اُسے کسی دوسرے کے امان نامے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اور اس طرح آپؑ جرأت اور شجاعت کے ساتھ اپنے موقّف سے آگاہ فرماتے ہیں۔

حتی کہ جب امام عالی مقام علیہ السلام کربلا پہنچ جاتے ہیں اور عمر ابن سعد، جو ظاہراً تیسری محرم الحرام کو واردِ کربلا ہوا تھا، تو چند روز تک امام حسین علیہ السلام اور عمر سعد کے درمیان مسلسل گفتگو ہوتی رہی ہے،عمر سعد چلا جاتا ہے اور پھر امام حسین علیہ السلام کے خیمے میں آکر بیٹھ جاتا ہے، پھر آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ اِن ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات میں امام عالی مقام علیہ السلام عمرِ سعد سے ایک شجاعانہ اور دو ٹوک جملہ ارشاد فرماتے ہیں۔ اب آپ یہاں اِس تمام صورتِ حال کا تصوّر کر سکتے ہیں۔ امام حسین علیہ السلام وہ ہستی ہیں جنہوں نے قیام کیا ہے اور اب اِس لق و دق صحراء میں ظاہری طور پر (دشمن کے) نرغے اور محاصرے میں ہیں۔ امامؑ کے ہمراہ کچھ خواتین و بچے اور چالیس (۴۰)، پچاس (۵۰) یا شاید ساٹھ (۶۰) مرد ہیں، شاید ان کی تعداد ابھی

ستّر تک بھی نہیں پہنچی ہے، جن میں جوان اور بوڑھے ہر قسم کے افراد شامل ہیں، سب اِس صحراء میں دشمن کے محاصرے میں ہیں، جن کی تعداد ہزاروں میں ہے اور وہ ہر قسم کے اسلحے سے لیس ہیں اور اسی لیے اجیر کیے گئے ہیں کہ یہاں لوگوں کا قتلِ عام کریں؛ وحشی (خونخوار) درندے کہ جن کے بارے میں خود امام عالی مقام علیہ السلام نے مکہ میں «عَسْلانُ الفَلوات» کی تعبیر بیان فرمائی تھی: «كَأَنِّي بِأَوْصالي يَتَقَطَّعُهَا عَسْلانُ الفَلوات بين النواويس وكربلا»[1] وہ بھوکے صحرائی خونخوار بھیڑیے، جن کے ہاتھوں میں تلواریں اور نیزے تھے اور وہ اپنا منہ پھاڑے عبید اللہ ابن زیاد کی طرف سے فراہم کیے گئے اپنے اِس شکار پر جھپٹنے کے منتظر تھے۔ کچھ اِس قسم کے وحشی لوگوں نے امام حسین علیہ السلام کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔

ظاہری صورتِ حال یہ ہے کہ حسین ابن علی علیہما السلام یہاں پر دشمن کے نرغے میں ہیں، کچھ اِس قسم کی صورتِ حال میں، آپ بتائیں کہ ایک انسان کا لب و لہجہ اور گفتگو کا انداز کیسا ہونا چاہیے؟ اُس وقت جب دشمن کے لشکر کا سپہ سالار، جو ظاہری طور پر غالب و کامیاب بھی نظر آتا ہے، امام حسین علیہ السلام کے خیمے میں آتا ہے اور ان دونوں کے درمیان بات چیت ہوتی ہے تو انداز کیسا ہونا چاہیے؟ ظاہری طور پر یہ بات چیت اس قسم کی ہونی چاہیے تھی کہ وہ امامؑ کو ملامت کرے کہ آپؑ یہاں کیوں آئے ہیں (اور آپؑ نے قیام کیوں کیا ہے؟) امامؑ بھی جواب میں کہیں کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا، اب ہم اس کا کوئی حل نکالتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مسئلہ اس

۱۔ بحار الانوار، تتمہ کتاب "تاریخ فاطمہ و الحسن و الحسین علیہم السلام"، باب۳۷: "گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ صحرائی بھیڑیوں نے نواویس اور کربلا کے درمیان ایک مقام پر میرے بدن کے اعضاء جدا جدا کر دیئے ہیں۔"

کے بالکل برعکس ہے۔ جب وہ امام حسین علیہ السلام کے خیمہ میں آتا ہے، تو امام عالی مقام علیہ السلام اُس سے پوچھتے ہیں: ''اے ابنِ سعد! تم کیوں ہمارے ساتھ اس تحریک اور قیام میں شامل نہیں ہو جاتے؟'' وہ کہتا ہے کہ میرے اہلِ خانہ اور بچے وہاں (کوفہ میں) ہیں وہ مشکل میں پڑ جائیں گے۔ امام عالی مقام علیہ السلام فرماتے ہیں: ''پس یہاں سے چلے جاؤ اور ہمارے ساتھ جنگ مت کرو اور عبید اللہ ابن زیاد کے حکم کی مخالفت کر دو۔'' وہ کہتا ہے: میں یہ بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھ پر حملہ کر دے گا اور میرا تمام اموال چھین لے گا۔ یعنی امام عالی مقام علیہ السلام اُسے مدافعانہ رویّہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اُس پر اعتراض کرتے ہیں اور وہ امام حسین علیہ السلام سے معذرت خواہانہ انداز میں بات کرتا ہے۔ امام عالی مقام علیہ السلام اِس موقعیت پر بھی اِس طرح کی قوی، مضبوط اور محکم نفسیاتی کیفیت کے حامل ہیں۔

البتہ جس وقت شہادت کی علامتیں واضح اور ظاہر ہو گئیں اور معلوم ہو گیا کہ اب یہاں شہادت ہی حتمی ہو چکی ہے، تو اُس وقت امام حسین علیہ السلام کا اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور بہت زیادہ قریبی اصحاب کے ساتھ لب و لہجہ مخصوص شکل اختیار کر گیا۔ البتہ یہ جو ہم کہہ رہے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کو (شہادت کے حتمی ہونے کے بارے میں) معلوم ہو گیا، اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام مکہ سے روانہ ہو رہے تھے، تو آپ کو معلوم نہیں تھا کہ شہید کر دیئے جائیں گے، نہیں۔ اس بات کو تو حتی کہ وہ شخص بھی سمجھ سکتا تھا، جو امام عالی مقام علیہ السلام کی حدّ تک علم و معرفت اور آگاہی نہ رکھتا ہو؛ جیسے کہ فرزدق شاعر اس بات کو سمجھ گیا تھا؛ کچھ وہ افراد جو کوفہ سے آئے تھے وہ بھی سمجھ گئے تھے؛ وہ لوگ جو امام عالی مقام علیہ السلام کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے، وہ بھی سمجھ چکے تھے، یعنی سب کے سب اس بات

کو سمجھ چکے تھے کہ اِس وقت، اِس قیام کا نتیجہ خونین قیام کی صورت میں ہی ظاہر ہو گا اور امام حسین ابن علی علیہما السلام شہید کر دیئے جائیں گے۔ اس لیے امام حسین علیہ السلام اِس بات کو بخوبی جانتے تھے، یہ بالکل وہی چیز تھی جس کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے سے خبر دی تھی اور سب اس بات کو جانتے تھے۔ ''عمر اَطرف'' امام حسین علیہ السلام کے بھائی اور امیر المومنین علیہ السلام کے فرزند، مکہ میں امامؑ کی خدمت میں آتے ہیں اور آپؑ کو یاد دلاتے ہیں اور کہتے ہیں: بھائی جان! کیا آپؑ کو یاد نہیں ہے کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ حسینؑ کو عراق میں شہید کر دیا جائے گا؟ اور اب آپؑ اِس صورتِ حال میں عراق جا رہے ہیں؟ آپؑ تو اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں: ''تم خیال کرتے ہو کہ جو تم جانتے ہو، میں نہیں جانتا؟ وہ چیز جو تمہیں یاد ہے، میں اسے بھول گیا ہوں؟ میں جانتا ہوں کہ میں شہید کر دیا جاؤں گا۔'' لیکن مسئلہ یہ نہیں ہے کہ امام حسین علیہ السلام شہادت سے خائف ہیں اور شہید ہونے سے بچنا چاہتے ہیں؛ عراق میں شہید ہونے کی مختلف صورتیں ہیں اور زمانے بھی مختلف ہیں۔

ایک وقت ایسا آیا جب سب کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ امام حسین علیہ السلام اِس مقام پر شہید کر دیئے جائیں گے۔ اُس وقت امام حسین علیہ السلام کی (اپنے عزیز و اقارب اور اصحاب کے ساتھ) گفتگو کا انداز تبدیل ہو گیا اور انسان دیکھتا ہے کہ اُس وقت امام حسین ابن علی علیہما السلام کے سچے اور باوفا ساتھی کونسے ہیں؟

حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام کا کردار

میرا خیال ہے کہ اس وقت یہاں چند جملے حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام کے بارے میں بھی عرض کروں، اگرچہ اِن چند جملوں سے جناب زینب کبریٰ علیہا السلام کا حق تو ادا نہیں ہو سکتا۔ واقعاً کربلا حضرت زینب علیہا السلام کے بغیر کربلا نہیں تھی، عاشورا حضرت زینب کبریٰؑ کے بغیر، وہ تاریخی یادگار اور جاودانی واقعہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس قدر حضرت علی علیہ السلام کی بیٹی کی شخصیت، اول سے آخر تک اِس واقعے میں، ظاہر اور عیاں ہے کہ انسان احساس کرتا ہے کہ یہ ایک نسوانی لباس اور علیؑ کی بیٹی کے روپ میں ایک دوسری حسینؑ ہیں۔ اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کہ اگر حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام نہ ہوتیں، تو عاشورا کا کیا ہوتا، شاید امام زین العابدین علیہ السلام بھی شہید کر دیئے جاتے، شاید امام حسین علیہ السلام کا پیغام بھی کسی تک نہ پہنچ پاتا۔ امام حسین علیہ السّلام کی شہادت سے پہلے کے لحظات میں بھی، حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام ایک ایسے سچے غمخوار کی مانند تھیں کہ جن کی موجودگی میں امام حسین علیہ السلام بالکل تنہائی اور تھکاوٹ کا احساس نہیں کرتے تھے؛ انسان حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام کے رُخِ انور اور آپؑ کے کلمات و فرمودات اور دیگر کاموں میں کچھ اِس قسم کے نقوش مشاہدہ کرتا ہے۔

حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام نے دو مرتبہ بےچینی و بےقراری کا احساس کیا اور امام حسین علیہ السلام کے پاس جا کر اپنی اس بےچینی و بےقراری کا اظہار بھی کیا۔ ایک مرتبہ (مکہ سے کوفہ کی طرف جاتے ہوئے) کسی ایک منزل پر جب جناب مسلم ابن عقیلؑ کی (مظلومانہ) شہادت کی خبر موصول ہونے کے بعد، امام حسین علیہ السلام حضرت زینب علیہا السلام کے خیمے میں تشریف لائے اور اِن خبروں

سے متعلق گفتگو فرمائی جو مختلف انداز (اور مختلف اوقات) میں موصول ہو رہیں تھیں؛ تو حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام بھی بالآخر ایک خاتون ہیں، جو نسوانی جذبات اور زنانہ لطیف احساسات بھی رکھتی ہیں؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ خاندانِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی تو دراصل لطیف جذبات و احساسات کا اصلی مظہر اور تجلی گاہ ہے تو بیجا نہ ہو گا۔

میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ صلابت و قاطعیت، قدرت و شجاعت اور مشکلات و مصائب کے مقابلے میں مقاومت و استقامت کے ساتھ ڈٹ جانے کے باوجود، انسانی لطیف و نفیس احساسات اور انسانی پاکیزگی و عطوفت کا جوش مارتا ہوا چشمہ بھی درحقیقت یہی خاندان ہے؛ میں (آپ کے سامنے) امام حسین علیہ السلام کی مثال پیش کروں، وہ شخص جو پوری مخالف دنیا کے سامنے تنِ تنہا کھڑے ہو جاتے ہیں اور صحراء میں بکھرے ہوئے بھوکے بھیڑیوں کے سامنے اکیلے مقاومت کرتے نظر آتے ہیں اور آپؑ کے پائے ثبات میں کوئی لرزش نہیں آتی، لیکن یہی ہستی بعض اوقات، بہت ہی معمولی چیزوں کے مقابلے میں بےانتہاء تحتِ تاثیر واقع ہوتی ہے؛ جیسے جب (میدانِ جنگ میں) ایک حبشی غلام زمین پر گر جاتا ہے تو امام حسین علیہ السلام اِس غلام کے سرہانے تشریف لاتے ہیں، یہ ایک سیاہ حبشی غلام ہے، جو آپؑ کے مخلصین اور ارادتمندوں میں سے ہے۔ یہ شاید جناب ابوذر کا غلام ''جَون'' تھا جو اُس وقت کی اجتماعی اور معاشرتی صورتِ حال اور ثقافت میں، حتی کہ خود مسلمانوں کے درمیان بھی، کسی خاص مقام و مرتبے اور حیثیت کا حامل نہیں سمجھا جاتا تھا، کوئی خاص مقام و منزلت نہیں رکھتا تھا۔ جب یہ حبشی غلام شہید ہو جاتا ہے، (یہ کوئی انہونی بات بھی نہیں تھی اب تک) بہت سے شہید ہو چکے تھے؛ کوفہ کے اشراف اور بڑے بڑے نامدار لوگ؛ جیسے:

حبیب ابن مظاہر، زُہیر ابن قین اور دوسرے افراد -جو کہ کوفہ کی بزرگ اور نامور ہستیاں تھیں- امام حسین علیہ السلام کی نُصرت میں جامِ شہادت نوش کر چکے تھے؛ لیکن اِن میں سے کسی کی بھی شہادت پر امام عالی مقام علیہ السلام نے اِس قسم کے احساسات اور جذبات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جب مسلم ابن عوسجہ کا وقت شہادت قریب تھا تو آپؑ نے انہیں مخاطب کرکے فرمایا: ''ان شاء اللہ تم خدا وند متعال سے اس کا اجر و ثواب پاؤ گے۔'' لیکن اِس حبشی غلام کی شہادت کے موقع پر کہ جس کا کوئی بھی نہیں ہے، نہ تو کوئی اولاد ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا عزیز و رشتہ دار اس کے انتظار میں ہے، جو اس کے لاشے پر گریہ کرے تو امام حسین ابن علی علیہما السلام اس کے سرہانے تشریف لاتے ہیں اور اِس غلام کے ساتھ بھی وہی کام کرتے ہیں جو آپؑ نے حضرت علی اکبر علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا۔ ''جَون'' کے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں اور اس کا خون آلود سر اپنے زانوئے مبارک پر رکھ لیتے ہیں، لیکن امامؑ کے بےچین دل کو تب بھی قرار نہیں آتا؛ ایک دفعہ سب یہ منظر دیکھتے ہیں کہ امام عالی مقام علیہ السلام جھکتے ہیں اور اپنے چہرۂ مبارک کو جَون کے خوں بھرے چہرے پر رکھ دیتے ہیں؛ امام عالی مقام علیہ السلام کچھ اِس قسم کے لطیف اور نازک انسانی احساسات و عواطف سے لبریز ہیں۔

لہٰذا حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام بھی ایک خاتون ہونے کی حیثیت سے لطیف زنانہ احساسات اور عواطف سے لبریز، نہ کہ ایک عام خاتون کی مانند، بلکہ امام حسین علیہ السلام کی بہن ہونے کی حیثیت سے، ایک ایسی بہن جو والہانہ طور پر اپنے بھائی کو چاہتی ہے، ایسی بہن جس نے (بھائی کی خاطر) اپنے شوہر اور اپنے خاندان وغیرہ سب کو چھوڑ دیا اور امام حسین علیہ السلام کے ساتھ (مدینہ سے) آ گئیں اور خود اکیلی بھی نہیں آئیں؛ بلکہ (اپنے ساتھ) اپنے دونوں بیٹوں

''عون و محمد علیہما السلام'' کو بھی لے آئی ہیں۔ میں احتمال دیتا ہوں کہ جناب عبد اللہ ابن جعفر اِس بات پر راضی نہیں تھے کہ ان کے یہ دونوں فرزند بھی کربلا جائیں۔ مجھے ان کے راضی ہونے کا یقین نہیں ہے، لیکن حضرت زینب علیہا السلام اِن دونوں شہزادوں کو ساتھ لائیں؛ تاکہ وہ ان کے ساتھ ساتھ رہیں اور اگر راہِ خدا میں جانثاری کی ضرورت پیش آئے تو انہیں شہادت (قربانی) کے لیے پیش کیا جا سکے۔

حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام نے راستے میں ایک منزل پر جب صورتِ حال کے خطرناک ہونے کا احساس کیا، تو امام حسین علیہ السّلام کی خدمت میں عرض کیا: بھائی میں یہاں خطرہ محسوس کر رہی ہوں اور مجھے صورتِ حال خطرناک لگ رہی ہے۔ باوجود اس کے کہ حضرت زینب علیہا السلام کو معلوم ہے کہ شہادتیں اور اسارتیں (اور قید و بند کی صعوبتیں) درپیش ہیں؛ لیکن یہ سب جانتے ہوئے بھی اِس قدر اِن (ناخوشگوار) حوادث و واقعات کے دباؤ میں آ جاتی ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کی طرف رجوع فرماتی ہیں۔ اس وقت امام عالی مقام علیہ السلام اپنی بہن سے زیادہ گفتگو نہیں فرماتے، صرف (بہن کی تسلّی کے لیے) اتنا ہی کہتے ہیں کہ جو خدا وند متعال چاہے گا، وہی ہو گا اور کچھ اِس قسم کی تعبیر ارشاد فرماتے ہیں: «مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ»[1] ''جو کچھ خدا چاہے گا وہی واقع ہو گا۔'' اس کے بعد ہم تاریخ میں حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام سے کوئی ایسا جملہ نہیں دیکھتے جو آپؑ نے اپنے بھائی (امام حسین علیہ السلام) سے کہا ہو یا کوئی سوال ہی کیا ہو یا امام حسین علیہ السلام سے اپنی نفسیاتی و روحانی کیفیت اور بےچینی کا اظہار کیا ہو، سوائے شبِ عاشور کے۔

۱۔ الکافی، ج۲، ص۵۳۰۔

عاشور کی شب کے ابتدائی حصّے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام شدّتِ غم سے بےچین اور مضطرب ہوئی ہیں؛ اس واقعے کے راوی -خود امام زین العابدین علیہ السلام ہیں جو اس وقت بسترِ بیماری پر تھے -امام زین العابدین علیہ السلام نقل فرماتے ہیں:میں اپنے خیمے میں لیٹا ہوا تھا اور میری پھوپھی حضرت زینبؑ میرے پاس بیٹھی، میری تیمارداری کرنے میں مصروف تھیں۔ ہمارے ساتھ والا خیمہ میرے بابا حضرت ابا عبد اللہ الحسین علیہ السلام کا تھا، جس میں آپؑ تشریف فرما تھے اور جنابِ ابوذر کے غلام ''جون'' میرے بابا کی تلوار تیز کر رہے تھے (اور اس کی دھار بنا رہے تھے)۔وہ لوگ کل (۱۰ محرم کو) پیش آنے والی جنگ کے لیے خود کو تیار کر رہے تھے۔ امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں: میں نے دیکھا کہ کچھ وقت کے بعد امام عالی مقام علیہ السلام نے زیرِ لب کچھ اشعار پڑھنا شروع کر دیئے، جن کا مطلب یہ تھا کہ دنیا (والوں) نے اپنا رُخ پھیر لیا ہے اور انسان کی زندگی بھی وفا کرنے والی نہیں ہے اور اب موت نزدیک ہے:

''یا دَھـرُ افٍّ لک مـِن خلـیلٍ

کَم لک بالاشراق والاصیل''[1]

یہ شعر اِس چیز کو ظاہر کرتا ہے کہ جو شخص یہ شعر پڑھ رہا ہے، وہ مطمئن ہے کہ بہت جلد اِس دنیا سے رخصت ہونے والا ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں: میں نے یہ شعر سنا تو اس میں موجود پیغام اور

۱۔ بحار الانوار، تتمہ کتاب ''تاریخ فاطمہ و الحسن و الحسین علیہم السلام''، باب۳۷، حدیث۱؛ ''اے زمانے! تیری دوستی پر افسوس ہے، تو نے شب و روز میں کتنے زیادہ دوستوں اور حق پرستوں کو موت کی نیند سُلا دیا ہے۔''

معنی کو بھی درک کر لیا اور سمجھ گیا کہ امام حسینؑ (اِس شعر میں) اپنی شہادت کی خبر دے رہے ہیں، لیکن میں نے خود کو سنبھالا۔ اچانک میری نظر اپنی پھوپھی زینبؑ کے چہرۂ اطہر پر پڑی، جو شدّتِ غم سے ناراحت تھیں، وہ اُٹھیں اور اپنے بھائی کے خیمے میں جاکر عرض کیا: بھائی جان! میں دیکھ رہی ہوں کہ آپؑ اپنی شہادت کی خبر دے رہے ہیں۔ ابھی تک ہمارا دل آپؑ کی وجہ سے خوش (اور پُر سکون) تھا۔ جب ہمارے بابا اِس دنیا سے رخصت ہوئے تو ہم نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلّی دے لی کہ ہمارے بھائی موجود ہیں، جب بھائی حسنؑ کی شہادت واقع ہوئی تو میں نے کہا کہ میرا بھائی حسینؑ تو میرے پاس ہے۔ میں نے سالوں آپؑ ہی کے وجود سے اپنے دل کو ڈھارس اور تسلّی دی ہے اور آج تک آپؑ کے بھروسے پر زندہ رہی ہوں، لیکن آج میں دیکھ رہی ہوں کہ آپؑ بھی اپنی شہادت اور موت کی خبر سنا رہے ہیں۔

البتہ حضرت زینب کبریٰؑ حق رکھتی ہیں کہ ناراحت و غمگین ہوں۔ میں تصوّر کر سکتا ہوں کہ اُس دن حضرت زینبؑ کی جو کیفیت اور حالت تھی، وہ ایک منفرد اور استثنائی حالت تھی۔ ہم کسی بھی دوسری عورت کی حالت کا، حتی کہ خود امام زین العابدینؑ کی حالت کا بھی، حضرت زینبؑ کی حالت اور کیفیت سے مقائسہ نہیں کر سکتے۔ (اُس دن) ثانی زہراءؑ کی کیفیت اور حالت، بہت سخت، طاقت فرسا اور ناگفتہ بہ تھی۔

روزِ عاشورا (لشکر حسینیؑ میں شامل) تمام جانثار (اپنی قربانی پیش کرکے) جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔ عصرِ عاشور سوائے امام زین العابدینؑ کے، خیامِ حسینیؑ میں کوئی مرد باقی نہیں رہا تھا اور امام زین العابدینؑ بھی شدّت

بیماری کی وجہ سے بستر پر پڑے تھے اور شاید بیہوشی کے عالم میں تھے۔

اب آپ دیکھیں کہ اِن (جلے اور لٹے ہوئے) خیام اور کاروانِ حسینیؑ میں تقریباً ۸۰ یا ۸۴ خواتین اور بچّے ہیں، جو چاروں طرف سے دشمن کے نرغے اور محاصرے میں ہیں، انہیں کتنی زیادہ تسلّی، تشفّی اور توجہ کی ضرورت ہے؛ اِن میں سے کچھ پیاسے اور کچھ بھوکے ہیں، بلکہ یہ کہا جائے کہ سب ہی بھوکے اور پیاسے ہیں، ساتھ ہی سب کے دلوں پر خوف اور وحشت سایہ فگن ہے۔ (اُن کے سامنے اپنے عزیزوں اور) شہداء کے لاشے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے زمین پر بکھرے پڑے ہیں، بعض اُن کے بھائی ہیں تو بعض اُن کے لختِ جگر۔

بہرحال یہ (کربلا کا واقعہ) ایک بہت ہی ناخوشگوار، غمگین اور وحشتناک صورتِ حال ہے، کسی ایک نے اِس پراکندہ اور بکھرے ہوئے کاروان کو اکٹھا کرنا (اور انہیں حوصلہ دینا) تھا اور وہ ایک ہستی صرف حضرت زینب کبریٰؑ کی ہی ہے۔

ایسا نہیں تھا کہ حضرت زینبؑ نے صرف اپنے عزیزترین بھائی امام حسینؑ کو ہی ہاتھ سے دیا ہو یا اپنے دونوں جگر گوشہ (یعنی عونؑ و محمدؑ) کو اور اپنے دوسرے بھائیوں اور دیگر اعزاء و اقرباء کو کھو دیا ہو اور یا بنی ہاشم کے اٹھارہ (۱۸) جوانوں اور (اپنے بھائی کے) باوفا اصحاب و انصار کو دے دیا ہو، اگرچہ یہ سب کچھ تو تھا ہی، لیکن شاید جس چیز کی اہمیت اس سے بھی زیادہ تھی، وہ یہ تھی کہ دشمن کے اتنے بڑے لشکر کے درمیان، اِس لٹے ہوئے پراکندہ اور بکھرے ہوئے قافلے کو سمیٹنے (اور انہیں ایک جگہ جمع کرنے) کی ذمہ داری بھی حضرت زینب کبریٰؑ ہی کی تھی، حتی کہ امام زین

العابدینؑ کی دیکھ بھال اور نگہداری بھی آپ ہی کے کاندھوں پر تھی۔

لہٰذا واقعۂ عاشورا کے رونما ہونے کے بعد سے لے کر، اُس لمحے تک جب یہ معلوم اور مشخّص ہو گیا کہ دشمن نے اِن خواتین اور بچوں کے ساتھ کیا کرنا ہے، اِن چند گھنٹوں کے دوران، جن میں ایک ظلمت بھری تاریک و وحشت ناک رات بھی تھی، خدا ہی جانتا ہے کہ یہ وقت حضرت زینب کبریٰؑ نے کس کرب و اذیّت اور کس بےچینی و اضطراب میں گزارا ہے؛ اس لیے آپؑ اِس رات اور اِن چند گھنٹوں میں مسلسل مصروفِ عمل نظر آتی ہیں، کبھی بھاگ کر ایک بچّے کے پاس جاتی ہیں (اور اُسے دلاسہ دیتی ہیں) تو کبھی دوڑ کر کسی خاتون کے پاس جاتی ہیں (اور اسے تسلّی دیتی ہیں)، کبھی کسی غمزدہ اور داغدیدہ ماں کے پاس پہنچ جاتی ہیں تو کبھی کسی ایسی بہن کے پاس، جس سے اُس کا عزیز بھائی بچھڑ گیا ہے۔ آپؑ مسلسل ایک ایک فرد کے پاس جاتی ہیں، انہیں ایک جگہ جمع کرتی ہیں، انہیں تسلّی دیتی ہیں اور ان کا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔

لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب جناب زینبِ عُلیا مقامؑ کا حوصلہ بھی جواب دے گیا، آپؑ اپنے شہید بھائی کی (مقتل گاہ کی) طرف رُخ کرتی ہیں، وہ بھائی جو تنہا آپؑ کی پناہ گاہ تھا۔

روایت میں ہے کہ حضرت زینب کبریٰؑ اپنے شہید بھائی کے پامال شدہ بکھرے ہوئے لاشے کے سرہانے تشریف لاتی ہیں اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے فریاد بلند کرتی ہیں:

«یا مُحَمَّدَاہ! صَلّی عَلَیکَ مَلائِکَةُ السَّماءِ»[1]

اے ہمارے نانا! اے پیغمبر خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آسمان کے فرشتے آپؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔

«هَذَا الْحُسَینُ مُرَمَّلٌ بِالدِّمَاءِ»

یہ کربلا کی گرم ریت پر خاک و خوں میں غلطاں، آپؐ کا پیارا حسینؑ ہے ۔ ۔ ۔

لَا حَولَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیمِ.

پروردگارا! تجھے شہدائے کربلا کے خون کی حُرمت کا واسطہ، ہمیں امام حسین علیہ السلام اور عاشورا کا پیروکار قرار دے۔

بارِ الٰہا! دنیا کے تمام مسلمانوں کو (خوابِ غفلت سے) بیدار کر دے اور سب کو امام حسین علیہ السلام کا (حقیقی) پیروکار بنا دے۔

خدایا! تجھے محمد و آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (کی عزّت و عظمت) کا واسطہ، اِس اسلامی نظام، اِس اسلامی حکومت اور اسلامی جمہوریہ کی، جو امام حسین علیہ السلام کی یادگار اور آپ کے خونِ ناحق کے طفیل حاصل ہوئی ہے اور آپؑ ہی کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے، حضرت ولی عصر امام مہدی علیہ السلام کے ظہور تک اِس کی حفاظت فرما۔

۱۔ اللہوف (فی وصف حال القتال و ما یقرب من تلک الحال)، سید ابن طاؤس، ص۱۳۳۔

پروردگارا! ہماری ہدایت و راہنمائی فرما۔ بارِ الٰہا! ہماری مدد و نُصرت اور تائید فرما۔ پروردگارا! صحیح راستے کی طرف ہماری راہنمائی فرما۔

پروردگارا! ہماری تمام مشکلات اور پریشانیوں کو دُور فرما۔ ہمارے دشمنوں کو سرنگوں اور ذلیل و خوار فرما اور تمام میدانوں میں ہمیں کامیابی و کامرانی عطا فرما۔ (آمین)

علمی مقابلہ

اس کتاب کے متن سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے چند سوالات تیار کیے گئے ہیں، اگر آپ اس علمی مقابلے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں تو اپنے جوابات درج ذیل کسی ایک طریقے سے ہمیں ارسال فرمائیں۔

۱۔ اپنے جوابات اِس ایڈریس پر ارسال فرمائیں: مشہد مقدّس، حرم مطہر امام رضاعلیہ السلام، صحن جمہوری اسلامی، مدیریت زائرین غیرایرانی، ص ب: ۳۱۳۱-۹۱۳۷۵

۲۔ اپنے جوابات مذکورہ ای میل پر ارسال کریں:

iro@imamrezashrine.com

۳۔ اپنے جوابات حرم مطہر امام رضاعلیہ السلام کی مذکورہ سائٹ کے ذریعے ارسال کریں:

www.imamrezashrine.aqr.ir

سوالات

۱۔ ادیان اور بالخصوص اسلام کی فرہنگ و ثقافت میں، حکومت کی تشکیل کا اصلی ہدف و مقصد کیا ہے؟

الف: ایک آرام دہ اور پُر آسائش زندگی تک پہنچنا اور عیش و عشرت کے ساتھ زندگی گزارنا۔

ب: ایک فریضۂ الٰہی اور ایک سخت و پُرخطر اور محرومیت سے بھرپور ایسی ماموریت، جو اجتماعی ذمہ داریوں کے سنگین ترین بوجھ اُٹھانے کے معنی میں ہے اور حکومت حاصل کر لینے والا شخص اپنے لیے کسی چیز کا خواہاں نہیں ہوتا اور نہ ہی بندگانِ خدا کو اپنے اقتدار کے پنجے میں اسیر خیال کرتا ہے۔

ج: اجتماعی ذمہ داریوں کے سنگین بوجھ اُٹھانے کے لیے حاصل ہونے والی یہ حکومت اور مالِ خدا (یعنی بیت المال) کو اپنے عیش و نوش کے رنگین دسترخوان پر مزید اضافہ کا باعث سمجھے اور اس سے بھرپور استفادہ کرے۔

د: ب اور ج دونوں مورد صحیح ہیں۔

۲۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجتماعی نظام کی تبدیلی اور لوگوں کی زندگی کے بارے میں کونسی عظیم ترین تحریک چلائی؟

الف: لوگوں کو طاغوتوں اور ظالم و جابر حکمرانوں سے نجات دلائی اور انہیں اپنی الٰہی ولایت، امامت اور رہبری کے سائے تلے بندۂ خدا بن کر زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھایا۔

ب: لوگوں کو بندوں کی اطاعت سے، خدا وند عالم کی اطاعت کی طرف اور بندوں کی عبادت سے، اللہ کی عبادت و بندگی کی طرف دعوت دی۔

ج: صرف قوموں کے اُمور و معاملات اپنے ہاتھ میں لے لینے کے لیے تحریک چلائی۔

د: الف اور ب دونوں مورد صحیح ہیں۔

۳۔ طاغوتی اور ظالم و جابر حکمران طبقہ کب اپنے لیے خطرے کا احساس کرتا ہے؟

الف: جب علماء و بزرگان قوم کو وعظ و نصیحت کرنے لگ جائیں۔

ب: جب علماء اور اہلِ علم لوگوں کو اخلاقی باتیں بتانے لگ جائیں۔

ج: جب یہ کہا جائے کہ یہ موجودہ نظام جس کا سربراہ اور صاحبِ اقتدار شخص طاغوت ہے، اِس کے تمام کارندے اور عمال طاغوت ہیں اور یہ ایک غلط نظام ہے، ایسے نظام کو تبدیل ہو جانا چاہیے۔

د: تمام مذکورہ موارد صحیح ہیں۔

۴۔ انبیائے الٰہی علیہم السلام کس اہم ترین مسئولیت اور ماموریت کی انجام دہی کے لیے مبعوث کیے گئے؟

الف: انبیاء علیہم السلام کی اصلی ماموریت اور ذمہ داری یہ تھی کہ ایسے معاشرے اور ایسی دنیا کو تشکیل دیں جو پروردگارِ عالم کے قوانین اور دستورات کے مطابق وجود میں آئی ہو۔

ب: انبیائے الٰہی علیہم السلام صرف لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔

ج: انبیائے الٰہی علیہم السلام لوگوں کو احکامِ الٰہی سکھانے اور اُن کے عقائد درست کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔

د: ب اور ج دونوں مورد صحیح ہیں۔

۵۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے کس ہدف و مقصد کے لیے قیام فرمایا تھا؟

الف: امام حسین علیہ السلام نے صرف حکومت کے حصول کے لیے قیام فرمایا تاکہ خود حکومت کی باگ ڈور سنبھال لیں، کیونکہ آپؑ دیکھ رہے تھے کہ یزید ایک غیر صالح اور فاسد و فاسق شخص ہے۔

ب: امام حسین علیہ السلام نے اس لیے قیام فرمایا تاکہ شہید کر دیئے جائیں، کیونکہ آپؑ دیکھ رہے تھے کہ زندہ رہنے کے ساتھ اپنے اس الٰہی وظیفے اور ذمہ داری کو انجام نہیں دے سکیں گے۔

ج: امام حسین علیہ السلام کا ہدف و مقصد خود قیام اور (یزید کی حکومت کے خلاف) ایک مزاحمتی تحریک کا آغاز کرنا اور اپنی مخالفت کا اعلان کرنا تھا۔

د: تمام مذکورہ موارد صحیح ہیں۔

فردی خصوصیات

نام: .....

فیملی نام: .....

فون نمبر: .....

ایمیل: .....

ایڈریس: .....

جواب نامہ

پہلا سوال	الف	ب	ج	د
دوسرا سوال	الف	ب	ج	د
تیسرا سوال	الف	ب	ج	د
چوتھا سوال	الف	ب	ج	د
پانچواں سوال	الف	ب	ج	د